۶ ۱۹۶۰

رجسٹر ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۳ عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۴	ماہ مئی اپریل ۱۹۶۰ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

آپ کو زندگی میں بارہا ایسی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا ہوگا جہاں رنگارنگ کے قمقمے روشن ہوں۔ روشنی کے ان مختلف مظاہر میں اگر ایک بنفشی ہے تو دوسرا قرمزی، ایک ازرقی ہے تو دوسرا اخضری، ایک کا رنگ اگر نارنجی ہے تو دوسرا سرخ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے ایک سطح بین آنکھ رنگوں کے اس اختلاف کو اس نور کے اختلاف پر محمول کرے جس سے یہ سارے قمقمے منور ہیں مگر یہ محض فریب نظر ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ مظاہر میں ہے حقیقت میں ان کے اندر قطعاً کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ سارے ایک ہی نور کے مختلف پرتو ہیں۔

روشنی کے ان رنگین فانوسوں کی طرح ایک تمدن کے مظاہر خواہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف نظر آئیں لیکن ان میں بھی کوئی بنیادی اور اساسی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ یہ بھی سارے ایک ہی بنیادی تصور کے رُخ زیبا کا عکس ہوتے ہیں۔ کسی تمدن کا اصل جوہر اس کے مظاہر حیات نہیں ہوتے بلکہ وہ بنیادی روح ہوتی ہے جو ان میں جاری و ساری رہتی ہے تمدن کا اصل محل انسان کا ذہن ہے اور اسی سے افکار و نظریات کی مختلف شعاعیں پھوٹتی ہیں جو بالآخر اس کی زندگی کے سارے گوشوں کو روشن کر دیتی ہیں۔ یہ مظاہر کے اعتبار سے خواہ کتنا متنوع نظر آئے مگر روح کے لحاظ سے ایک ہی ہوتا ہے۔ تمدن ایک مخصوص ذہنی میلان یا اندازِ فکر کا نام ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار کی تشکیل کرتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ کسی قوم کا مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے جس کے مطابق اس کے افراد پر حالات و واقعات کا ایک خاص ردِ عمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی قوموں کے

محسوس ظاہری اختلاف کے باوجود ہم انہیں ایک ہی تمدن کے حامل کی حیثیت سے جانتے ہیں کیونکہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اُن کی سرشت کا خمیر اٹھایا گیا ہے وہ سب میں یکساں اور مشترک ہیں۔

پھر اسی تمدن کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح روشنی کے رنگا رنگ فانوسوں سے جو فضا منور ہوتی ہے اس کا تاثر ایک ہوتا ہے، بالکل اسی طرح تمدن کے مختلف مظاہر سے جو ماحول بنتا ہے اُس میں پُوری ہم آہنگی اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ بلکہ تمدن کا تو کام ہی یہی ہے کہ وہ ایک ایسی معاشرتی فضا ہموار کرتا ہے جس میں لوگ سیاسی قوت وطاقت اور آئینی پابندیوں کے بغیر اپنے آپ کو سیرت وکردار کے ایک خاص سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور اس طرح اُن کے اندر افکار و نظریات اور احساسات و جذبات کی وحدت نمودار ہوتی ہے

یہ وحدت کسی فرد یا قوم کا سب سے اہم سرمایہ ہے۔ اسی کے ذریعہ ایک قوم یا ملت دوسری اقوام یا ملل سے اپنے آپ کو ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔ خاص طور سے اُس قوم کے لیے تو اس کا وجود اور بھی ضروری ہے جس کی اساس نہ تو جغرافیائی حدود ہوں اور نہ ہی رنگ و نسل اور زبان کے اختلافات۔ ایسی قوم اگر اپنا ملی وجود برقرار رکھنے کا عزم رکھتی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرتی نقطۂ نظر سے دوسری اقوام سے الگ ہو۔ خیالات و نظریات کا اختلاف بلاشبہ قوموں کی ذہنی نشوونما کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن ایک عام آدمی اس اختلاف کو اس کے پورے مضمرات کے ساتھ اُسی وقت سمجھ سکتا ہے جب یہ افکار و نظریات تمدن کے رنگا رنگ مظاہر میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوں۔

بھی نہیں بلکہ اسی معاشرتی وحدت کی بدولت قوم کے مختلف افراد اور طبقات کے درمیان کامل اتحاد جنم لیتا ہے۔ دنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں جو اپنے احساسات اور افکار کے نقطۂ نظر سے دوسرے افراد سے پوری طرح متفق اور متحد ہو۔ بُعد مکانی اور انفرادی اغراض کے تصادم سے افراد میں بالکل فطری طور پر علیحدگی کا احساس موجود رہتا ہے۔ علیحدگی کے اس احساس کو اگر ایک طرف افکار و نظریات کی ہم آہنگی اتحاد و اتفاق میں بدلتی ہے تو دوسری طرف معاشرت کا جذباتی تعلق بھی سماج کے مائل بہ انتشار اجزا کو جوڑ کر انہیں بنیان مرصوص بناتا ہے۔ ملت جو ایک نفسیاتی حقیقت ہے اپنا اظہار دو طریقوں سے کرتی ہے۔ ایک تو افراد کی ذہنی کیفیات کے ذریعہ اور دوسرے تمدنی اداروں کے توسط سے، جیسے زبان، ادب، فنونِ لطیفہ وغیرہ۔

یہ ذہنی کیفیات اور تمدنی ادارے نہ صرف افراد کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں بلکہ ایک فرد کے اندر بھی جذباتی اور نفسیاتی ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ ہم میں سے کون سا ایسا شخص ہے جس کے جذبات اور امیال و عواطف میں کشاکش نہ ہو۔ ان بھری ہوئی قوتوں کو اگر یونہی برسرِ پیکار رہنے دیا جائے تو انسانی خودی کا استحکام نہیں ہو سکتا۔ یہ معاشرتی ماحول کا اعجاز ہے کہ وہ ان ناتراشیدہ عناصر کی تہذیب کر کے ان کے اندر تطابق و توافق پیدا کرتا ہے اور اس طرح انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی میں توسیع و استحکام کا ذریعہ بنیں۔ انسانی عزائم کی تہ ٹٹولیے تو ان کے ڈانڈے ہمیشہ جذبات سے ملے ہوئے نظر آئیں گے جو افراد اور جماعتوں کو تخلیقِ مقاصد پر ابھارتے ہیں۔ بزمِ حیات کی رونق انہیں کے دم قدم سے قائم ہے۔ اگر آپ زندگی کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں عقل سے کہیں زیادہ جذبات اور احساسات کو دخل حاصل ہے۔ زندگی کی ان بیش بہا قوتوں کو صحیح راہ پر لگانے کے لیے جہاں افکار و تصورات ضروری ہیں وہاں معاشرتی ماحول بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہ

کہیں گے کہ اس کی اہمیت معتقدات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے کیونکہ جذبات جس شدت کے ساتھ معاشرتی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں نظریات وافکار سے کبھی نہیں ہوتے۔

معاشرتی ماحول کی اہمیت کو دنیا کی ہر زندہ قوم نے پوری طرح محسوس کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنے تمدنی اور تہذیبی اداروں کی وساطت سے اس ماحول میں ہم آہنگی پیدا کی جائے کیونکہ اس چیز کے ناپید ہو جانے سے نہ صرف افکار و نظریات متزلزل ہوتے ہیں بلکہ جذبات واحساسات کی دنیا بھی زیر وزبر ہو جاتی ہے۔ آپ کسی زندہ قوم کی ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اُس قوم کے بنیادی تصورِ حیات کی ترویج و اشاعت کے لیے پوری طرح وقف ہیں۔

اسلام سے قبل اہلِ عرب جس کلچر کے دلدادہ تھے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے دن اور ان کی راتیں شراب خوری اور رقص وسرود کی محفلوں میں بسر ہوتیں۔ مرد وزن کے آزادانہ میل جول کا یہ عالم تھا کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے لیے جب لوگ آتے تو برہنہ ہو کر آتے۔ عورتوں کے حسن کے کھلے بندوں چرچے کیے جاتے اور ان سے آشنائی پر فخر کا اظہار ہوتا۔ اسلام جب دنیا میں آیا تو اس نے فکر ونگاہ کے زاویے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان تہذیبی سرگرمیوں کو بدل کر رکھ دیا جو اس قوم میں عرصۂ دراز سے جاری تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شراب پر ان مرمٹنے والوں نے نہ صرف اس دخترِ رز سے کلی اجتناب کیا بلکہ ساغر ومینا بھی توڑ دیے۔ وہ کان جو عود و بربط اور چنگ ورباب کے علاوہ کسی دوسری آواز سے ناآشنا تھے اُن کے لیے اب اگر کوئی آواز خوش آئند معلوم ہوتی تو وہ صرف کلامِ الٰہی کی آواز تھی۔ مذہبیہ اور زہاد صائیں کے ان قدر دانوں کے اندر عفت وعصمت کا اتنا شدید احساس پیدا ہوا کہ سخت سے سخت نازک موقعوں پر بھی اُن کا دامن معصیت سے آلودہ نہ ہونے پاتا تھا۔ معصیت تو خیر ایک بڑی چیز ہے وہ تو اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ معاشرے کے اندر اس بات

کو بھی گوارا نہ کیا جاتا کہ کسی غیر مرد کا طائرِ وسوسہ بھی کسی خاتون کے حریمِ عفت کی طرف پرواز کرے۔

کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ تشویشناک صورتِ حال اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اُس کے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات کے اندر انتشار ہو یا دوسرے لفظوں میں جن معتقدات پر وہ ایمان رکھتی ہے اور اُن کی ترویج کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن سمجھتی ہے انہیں عمل کی دنیا میں نظر انداز کر دے۔ نہ صرف نظر انداز کرے بلکہ ایک ایسی روش اختیار کرے جس سے ان نظریات کی نفی ہوتی ہے۔

امتِ مسلمہ ایک عرصہ دراز سے قول و عمل کے اسی تضاد میں گرفتار چلی آ رہی ہے افکار و نظریات کی دنیا میں بار بار تحریک ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ اب یہ قافلہ ایک صحیح سمت پر قدم اٹھانے والا ہے۔ لیکن افسوس کہ توقعات کے یہ خواب اور امیدوں کے یہ خیالی خاکے قلب و نگاہ کو پوری طرح نشاط و آسودگی بھی بخشنے نہیں پاتے کہ عمل کی دنیا میں بعض ایسی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں جن سے دل بیٹھ جاتے ہیں اور پوری قوم ایک شدید دھچکا سا محسوس کرتی ہے۔

آپ دُور نہ جائیے، صرف پاکستان کے گذشتہ ۱۴ برس کے واقعات پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جس چیز نے ہماری ترقی کا راستہ روک رکھا ہے وہ اسلام کے معاملے میں قول و عمل کا یہی تضاد ہے۔ ہمارے رہنماؤں کے بیانات اور اعلانات سے جو امیدیں بندھتی ہیں خود انہی کی سرگرمیوں سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس ملک اور قوم کا جو گہرا تعلق ہے، خواہ وہ جذباتی ہی سہی — اُسے دنیا پوری طرح جانتی ہے لیکن اس دین کے ساتھ عملاً جو سلوک کیا جا رہا ہے اُس کو حسنِ ظن کی آخری سرحد کو چھو لینے کے بعد

بھی سراہا نہیں جا سکتا۔ ان سارے واقعات کی اگر پوری تفصیل بیان کی جائے تو بات طویل ہو جائے گی اس لیے ہم صرف گذشتہ دو ماہ کی ثقافتی کارگزاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو آج اس اسلامی معاشرے میں جاری ہیں۔

ایک انسان جب ایک طرف صدرِ مملکت اور ارباب بست وکشاد کے خوش کن اعلانات دیکھتا ہے اور دوسری طرف ان اخلاق سوز سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہے جو اسلام کی عین ضد ہیں تو گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے اور حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ آخر ان کی ترقی سے اس ملت کو کس طرح قوت وطاقت فراہم ہو گی اور اسلامی انقلاب کا خواب کس طرح شرمندۂ تعبیر ہو گا۔

آیئے اب یہ دیکھیے کہ خلوص نیت کے باوجود قوم کو کس ذہنی انتشار میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے محترم صدرِ مملکت نے ابھی پچھلے دنوں حلفِ وفاداری اٹھاتے ہوئے جو تقریر ارشاد فرمائی تھی اس کے چند فقرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

> "میرا اوّلین فرض یہ ہے کہ میں اس خدائے عزوجل کا شکریہ ادا کروں جس نے مجھے وطنِ عزیز کی خدمت کرنے کا موقع عطا کیا ہے میں اس کی رحمتوں اور برکتوں کے لیے دعا مانگتا ہوں تاکہ میں اس اعتماد سے جرأت اور دیانتداری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکوں جس کا مجھ پر اظہار کیا گیا ہے۔ میرا دوسرا فرض یہ ہے کہ میں اُن تمام لوگوں کا دلی شکریہ ادا کروں جنھوں نے مجھ پر اظہارِ اعتماد کیا۔ میں ان کے اعتماد کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر وہ کام کروں گا جس کی میرا جسم اور روح اجازت دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے جنہوں نے میرے خلاف ووٹ دیا ہے میں یہ کہوں گا کہ آپ نے رائے دہی کے اپنے بنیادی حق کو جرأت سے بلا خوف استعمال کیا ہے اور میں آپ کو بھی مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ کر سکا کروں گا۔"

> "میں آپ کے اعتماد کے ووٹ کی تعمیل میں بہت جلد آئین کمیشن مقرر کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو ملک کے اہم اور ممتاز آدمیوں پر مشتمل ہو گا تاکہ وہ جہاں تک

ممکن ہو۔ اپنی سفارشات پیش کرے۔ اصل میں ہمیں ایک ایسے آئین کی ضرورت ہے جو جمہوری ہو اور جسے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور جس پر عمل کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ جس کو چلانے کے لیے کم خرچ کرنا پڑے۔ ہمیں ایک ایسے آئین کی ضرورت ہے جو ہمیں ایک اچھے مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے۔ یہ کام کہ حکومت کے کاروبار میں اسلامی روح منعکس ہو ایک مشکل اور نازک خواہش کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن میں حکومت کے کاروبار میں اسلامی روح پیدا کرنے کی پوری ایمانداری اور سرگرمی سے کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایمان چند عقائد کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم زندگی کی روح کے سائنسی ادراک میں بھی پایا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ آؤ ہم سب کوشش کریں اور دیکھیں کہ ہم انسان ہونے کی حیثیت سے کہاں تک خدا کے اس عظیم مذہب پر عمل کر سکتے ہیں۔ (کوہستان - ۱۶ر فروری ۱۹۶۰ء)

اس مقدس اعلان کے پورے آٹھ دن بعد اخبارات میں یہ خبر آتی ہے:

"میوزک کانفرنس کے سات اجلاس باغ جناح کے اوپن ائیر تھیٹر میں ہوئے جو ہفتہ سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ کانفرنس کے پروگرام میں ہلکی پھلکی اور کلاسیکی دونوں نوع کی موسیقی شامل تھی اور ان پروگراموں میں پاکستان، ہندوستان اور ایران کے کہنہ مشق اساتذہ کے علاوہ نوعمر جواہر قابل نے بھی حصہ لیا۔ پیر کی شب کو ہلکی پھلکی موسیقی کا پروگرام تھا۔

بدھ کی رات کو صدر مملکت محمد ایوب خاں نے بالکل غیر متوقع طور پر محفل موسیقی کو رونق بخشی۔ یہ کانفرنس کی آخری نشست تھی اور اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس میں چیدہ چیدہ فنکاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ صدر نے بڑے انہماک سے روشن آرا بیگم اور ستار نواز شریف پونچھ والے کے نغمات سنے۔ ملک کے مصروف ترین رہنما کی آمد جس طرح غیر متوقع تھی اسی طرح وہ توقع سے زیادہ دیر محفل میں بیٹھے اور اس سے فنکاروں کے

حوصلے بڑھے۔ اس نشست میں استاد سردار خاں، استاد قادر بخش کھاوجی، مختار بیگم اور دوسرے فنکاروں نے بھی بلند معیار کی چیزیں پیش کیں۔ یہ محفل درحقیقت اس کانفرنس کی روح تھی اور ایک طرح سے ملک کی مایۂ ناز مغنیّہ روشن آرا بیگم کی محفل تھی . . . . سامعین نے بڑے احترام اور انہماک سے روشن آرا کو سنا اور جب انہوں نے راگ ختم کر لیا تو مزید کی فرمائش کی . . . . جب مرغانِ سحر کی اذانیں فضا میں گونجنے لگیں تو روشن آرا نے تنبورا ہاتھ سے رکھ دیا اور یہ یادگار محفل برخاست ہوئی۔" (امروز۔ ۲۵ فروری ۱۹۶۰ء)

اس موقع پر جن فنکاروں نے اپنے فن کے کمالات دکھائے اُن کی باقاعدہ پذیرائی کی گئی اور مملکت کے سب سے بڑے سربراہ نے جو اسے ایک اسلامی مملکت بنانے کا عزم رکھتے ہیں، ان فنکاروں کی خدماتِ جلیلہ کا پوری طرح اعتراف کرتے ہوئے یوم پاکستان کے موقع پر انہیں مختلف انعامات سے نوازا۔ روشن آرا بیگم، عباس الدین احمد، مبارک علی اور فتح علی، ان میں سے ہر ایک کو پریذیڈنٹ میڈل کے علاوہ پانچ ہزار کی خطیر رقم بھی عطا کی گئی (پاکستان ٹائمز، ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء)

یہی نہیں بلکہ مرکزی حکومت نے کھیلوں اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی اُس نے حال ہی میں مرکزی کابینہ کے سامنے مندرجۂ ذیل تجاویز رکھی ہیں:

(۱) ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے دو خود مختار ادارے قائم کیے جائیں جن میں ایک ادارہ رقص و موسیقی اور دوسرا فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے کا کام کرے گا۔ یہی ادارے آرٹ کونسلوں، رقص، ڈراموں اور فلموں کے اداروں کی نگرانی کریں گے۔

ان اداروں کے کام کو صحیح طریق پر انجام دینے کے لئے لائبریریاں بھی چاہییں (یعنی وہ لٹریچر جو ناچ، گانے، فلم سازی وغیرہ پر شائع ہو چکا ہے، اسے جمع کیا جائے)۔

(۲) ان فنون کی باقاعدہ تربیت دینے کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام کیا جائے۔

(۴) صدرِ مملکت سے اپیل کی جائے کہ ان ثقافتی اداروں کے قیام کے لیے جو چندہ دیا جائے اسے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

(۵) کھیلوں اور ثقافتی محفلوں میں شرکت کے لیے کھلاڑیوں اور فن کاروں کو ہوائی جہاز اور ریل گاڑی کے سفر میں رعایت دی جائے۔

(۶) کھیلوں اور ثقافتی محفلوں کو ٹیکس سے بری کیا جائے۔

(۷) موسیقی اور کھیل کے سامان کی درآمد سے ڈیوٹی ختم کی جائے۔

(۸) کھلاڑیوں اور فن کاروں کے لیے انشورنس سکیم تیار کی جائے۔

یہ سفارشات اُس ملک کی کابینہ سے کی جارہی ہیں جسے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے شمار قربانیاں دے کر صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اُس وقت یہ معلوم ہو جاتا کہ آنے والے پاکستان میں حکومت کو اقامتِ صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بجائے رقص و سرود، فلموں اور ڈراموں، اور "فنونِ لطیفہ" کے فروغ سے دلچسپی ہوگی اور اس میں تبلیغِ دین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والوں کے بجائے "ثقافتی محفلیں" آراستہ کرنے والے گویّوں کو ریل اور ہوائی جہاز کے سفر کی سہولتیں دی جائیں گی اور خیر و صلاح کے کاموں کے بجائے اِن ثقافتی اداروں کو دیے جانے والے چندے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے تو وہ کبھی جان و مال کے اس زیاں پر آمادہ نہ ہوتے۔ انہوں نے اگر آگ و خون کے سمندر سے گزرنا گوارا کیا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس خطۂ پاک کو اسلام کی تجربہ گاہ دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ ناچ رنگ اور فسق و فجور کی ثقافت اور یہ مصوری و مجسمہ تراشی کسی پاکستان کے قیام کی محتاج نہ تھی۔ یہ سارے کام تو متحدہ ہندوستان میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ ہو سکتے تھے بلکہ شاید اس سے بہتر ہوتے، کیونکہ ہندو تہذیب اور مذہب، دونوں ان کو پروان چڑھانے میں مددگار بن سکتے تھے۔

اس معاملہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ رقص و موسیقی کے ان اداروں کے قیام کو بھی اسلام ہی کی ایک بہت بڑی خدمت بتایا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہی مس روشن آرا صاحبہ نے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، علمائے دین اور دین دار لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا ہے کہ "آپ لوگ جو رقص و موسیقی کو حرام قرار دے کر ان کے خلاف لوگوں میں نفرت کا جذبہ ابھار رہے ہیں، آپ کا یہ موقف غلط ہے اور صحیح مسلک یہ ہے کہ چونکہ رقص و موسیقی سے روحانیت کو جلا حاصل ہوتی ہے اس لیے اسلام رقص و موسیقی کا مخالف نہیں۔"

مس روشن آرا کے اس نظریہ کی تائید مغربی پاکستان کے گورنر جناب اختر حسین صاحب یوں فرماتے ہیں:

"مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں ثقافت اور اس کے مختلف مظاہر، جس میں فنونِ لطیفہ، تعمیرات، مصوری اور موسیقی شامل ہیں، کی پوری پوری سرپرستی کی ہے۔ حکومت پاکستان کو مسلمانوں کے اس تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کی قدر و قیمت کا اچھی طرح احساس ہے اور اس نے ان سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کے لیے مختلف اداروں کو ۱۰ لاکھ روپے کی مالی امداد دی ہے۔"

(پاکستان ٹائمز۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۰ء)

مشرقی پاکستان کے گورنر جناب ذاکر حسین صاحب نے بھی اسی قسم کے احساسات کا اظہار فرمایا ہے:

"پاک و ہند کے مسلمان موسیقی میں عظیم الشان روایات کے حامل ہیں۔ خصوصاً مغل بادشاہوں نے کلاسیکی موسیقی کی سرپرستی کرکے اس کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں جو عظیم خدمت سرانجام دی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں سیاسی غلامی کی وجہ سے اس بیش قیمت ورثہ کی پوری طرح حفاظت اور پاسبانی نہ کر سکیں۔ یہ بات بڑی خوش آئند معلوم ہوتی ہے کہ موسیقی کا ذوق لوگوں میں پھر سے بیدار ہو رہا ہے۔" (پاکستان ٹائمز ۲۰ فروری ۱۹۶۰ء)

بے شک، ان فنونِ عالیہ کا بڑا دَور دورہ محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ جیسے تیمرگانِ ملت کے دَور میں رہا ہے۔ لیکن اس وقت ان مشاغل میں مستغرق رہنے کے باوجود کوئی ان چیزوں کو میں "اسلامی تہذیب" قرار دینے والا نہ تھا، اور نہ کسی رقاصہ ومغنیہ کی یہ ہمت تھی کہ علماء اور اہلِ دین کو خطاب کر کے یہ کہہ سکتی کہ میرے اس کام کو حرام قرار دینے میں تم غلطی پر ہو۔ یہ تازہ ترقی اس پاکستان میں ہمیں میسر آئی ہے جس میں ہم کو "ایک اچھے مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے" کا ارادہ ظاہر فرمایا جا رہا ہے

ان بیانات میں چونکہ اسلام اور اسلامی روایات کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اور موسیقی کو دینی خدمت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نظر اسلامی تعلیمات پر بھی ڈال لیں۔ قرآن حکیم میں سورۂ لقمان میں نہایت واضح الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (رکوع ۱)

اور لوگوں میں سے کوئی ہے جو "لہو الحدیث" کا خریدار بنتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے بے جانے بوجھے لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکائے اور اس کا مذاق بنائے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

حضرت حسن بصری "لہو الحدیث" کی تشریح میں فرماتے ہیں:

كل ما شغلك عن عبادة الله وذكره من السمر والاضاحيك والخرافات والغناء ونحوها۔ (روح المعانی)

"لہو الحدیث" میں ہر وہ چیز شامل ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے غافل کرنے والی ہو مثلاً قصہ گوئی ہنسی مذاق کی باتیں، واہیات مشغلے اور گانا بجانا وغیرہ

روایات میں ہے کہ نضر بن حارث نے ایک مغنیہ صرف اس غرض کے لیے خرید رکھی تھی کہ اُس کے ذریعہ لوگوں کو دینِ حق سے برگشتہ کرے۔ اُسے جب کسی شخص کے متعلق یہ علم ہوتا کہ اس کا دل

اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے تو فوراً اس عورت کو اُس کی خدمت میں بھیج دیتا تاکہ وہ اسے اپنے دلکش نغموں سے مسحور کرے اور پھر اس شخص سے مخاطب ہو کر کہتا: دیکھو یہ اُس سے بہتر ہے جس طرف کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں بلا رہے ہیں۔ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا تو زندگی پر شاق گذرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزامیر و ملاہی کو یکسر حرام قرار دیا ہے اور امام بخاری نے اسی چیز کو ایک باب کا عنوان قرار دیا ہے۔

طبرانی وغیرہ نے ابن عباس سے یہ حدیث مرفوع روایت کی ہے کہ شیطان نے کہا، اے رب! میرے لیے ایک گھر خاص کر دے۔ خدا نے فرمایا: تیرا گھر حمام ہے۔ اس نے کہا میرے لیے ایک قرآن بنا دے (قرآن کے لفظی معنی ہیں، ہر وہ کلام جو بار بار پڑھا جائے) فرمایا تیرا قرآن شعر ہے۔ اُس نے کہا، میرے لیے ایک مؤذن مقرر کر دے۔ فرمایا، تیرا مؤذن مزمار (باجا) ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ۔ (۱۷: ۶۴)	ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے، بہکانے کی کوشش کرے، اور اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا۔

شیطان کی آواز کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ وہ گانا ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

اِنَّمَا نُهِيتُ عن صوتين احمقين فاجرين صوت لهوٍ ولعبٍ ومزامير الشَّيْطٰنِ وصوت لطم خدود و شق جيوب ودعاء بدعوى الجاهلية	مجھے دو احمق اور فاجر آوازوں سے منع کیا گیا ہے ایک لہو و لعب اور مزامیر شیطان کی آواز۔ دوسرے منہ پیٹنے، گریبان پھاڑنے اور جاہلیت کے نعروں کی آواز۔

مزامیر کی حرمت پر اہلِ علم کا پورا پورا اتفاق ہے۔ ابن الصلاح نے تو دف اور سارنگی پر گانے کی حرمت پر بھی علما کا اجماع نقل کیا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر رفقاءِ کار کا احساس اس گانے بجانے کے معاملہ میں جس قدر نازک تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل

واقعات سے کیا جا سکتا :

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے طبلہ کی آواز سنی تو کان بند کر لیے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

(سنن ابن ماجہ کتاب النکاح، باب الغنا والدف)

اسلام کا یہی بطلِ جلیل ایک دفعہ اونٹ پر جا رہا تھا۔ چرواہے کی بانسری کی آواز کان میں آئی تو فوراً کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور پہلا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ وہ اس اثنا میں بار بار اپنے غلام نافع سے پوچھتے تھے کہ کیا ابھی آواز آ رہی ہے؟ جب انہوں نے کہا "نہیں" تو کانوں سے انگلیاں نکالیں اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے مواقع پر یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے (طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ مجھے مزامیر اور معازف مٹانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔[1]

حضور سرورِ کائنات اور خلفائے راشدین کے دور کے بعد بھی فقہا اور صلحا نے اس گانے بجانے کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا: میں بغداد کو ایک ایسی چیز کی وجہ سے چھوڑ آیا ہوں جسے زندیقوں نے ایجاد کیا ہے یعنی گانا بجانا۔ اس کے ذریعے انہوں نے لوگوں سے قرآن چھڑا دیا ہے۔

یزید بن ہارون کا قول ہے: یہ گانا بجانا فاسقوں کا عمل ہے اسلام میں کبھی نہ تھا۔

امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا اَکْرَهُهٗ وَ هُوَ مُحْدَثٌ، یعنی میں اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یہ بدعت ہے پھر پوچھا

---

[1] مزامیر وہ آلات طرب ہیں جو منہ سے بجائے جائیں اور معازف وہ آلات ہیں جو ہاتھ یا مضراب سے بجائے جائیں۔

گیا کہ کیا آپ کو ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا گوارا ہے؟ فرمایا: نہیں۔

یہی حال دوسرے ائمۂ دین کا تھا۔ سب نے اسے ممنوع، مکروہ اور ناپسندیدہ بتایا۔ اکابر صالحین نے بھی اسی روش کو اختیار کیا۔ انہوں نے کبھی ایسے سماع میں شرکت نہیں کی چنانچہ ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخیؒ، ابوسلیمان دارانیؒ، احمد ابن ابی حواریؒ، سری سقطیؒ نے کبھی ایسی شیطانی مجالس میں جانا پسند نہ فرمایا۔[1] اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ عدیؒ، شیخ البیانؒ، ایسے جلیل القدر مشائخ بھی اس لعنت سے ہمیشہ دور ہی رہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور اس طرز کے دوسرے بزرگوں نے تو اس کی بالتصریح مخالفت کی ہے۔

بزرگانِ چشت نے اگر گانا سنا ہے تو وہ عورتوں اور لڑکوں کا نہیں بلکہ سن رسیدہ صالح لوگوں کا گانا مزامیر کے بغیر ہوتا تھا، اس میں صرف صلحا شریک ہوتے تھے، اور صرف توحید و معرفت کے پاکیزہ اشعار گاتے جاتے تھے۔ یہ آخری حدِ جواز ہے جسے نقطۂ آغاز بنا کر روشن آرا بیگم اور مختار بیگم کے گانوں تک نوبت پہنچا دینا اور پھر دعویٰ کرنا کہ اسلام اس موسیقی کو حلال کرتا ہے، خدا کے دین پر سخت ظلم ہے۔

امت کے ائمہ اور صلحاء نے اس قسم کی کلچرل سرگرمیوں کے خلاف صرف فتویٰ دے دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُن اسباب و علل پر بھی بحث کی ہے جن کی وجہ سے یہ گانے بجانے کا مشغلہ اسلام میں حرام ٹھیرایا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ اس ثقافتی شغل سے لوگوں کے اندر قرآن سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ "گانا زنا کا افسون ہے"۔ اور یہ بات بالکل صحیح و درست ہے۔ مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے لوگ جو چاہیں کہتے رہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس سے انسانی دل و دماغ پر نہایت بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ جس طرح شراب

---

[1] السماع والرقص، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

ایک انسان کو بدمست کردیتی ہے بالکل اسی طرح گانا سن کر انسان پر حالتِ سکر طاری ہوجاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ شراب منہ کے راستے سے پیٹ کے اندر داخل کی جاتی ہے اور گانا بجانا کانوں کے ذریعہ جسم کے اندر سرایت کرتا ہے۔ بہرحال اس امر واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدیم ترین زمانہ سے موسیقی، رقص، شراب اور زنا کے درمیان گہرا تعلق رہا ہے۔

اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ابوالفرج بن جوزی نے ارشاد فرمایا:

"گانے میں دو مضرتیں ہیں: ایک طرف تو وہ قلب کو عظمتِ الٰہی میں تفکر سے روکتا اور اس کی خدمت سے باز رکھتا ہے۔ دوسری طرف اُسے مادی لذتوں کی تحصیل کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام مادی لذتیں حاصل کرلی جائیں اور معلوم ہے کہ مادی لذتوں میں سب سے زیادہ قوی مرد اور عورت کے اختلاط کی لذت ہے۔ مگر یہ لذت اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس میں تجدد ہوتا رہے اور ظاہر ہے کہ حلال طریقہ پر یہ تجدد ممکن نہیں۔ لہٰذا گانا زنا کا محرک ہے۔ ان دونوں میں گہری مناسبت ہے۔ گانا روح کی لذت ہے اور زنا نفس کی سب سے بڑی لذت[1]۔"

دورِ جدید کے بہت بڑے مبصر علامہ اقبالؒ نے بھی آرٹ پر بحث کرتے ہوئے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کے محتاج ہیں:

"حیات، تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسانی اعمال کا مقصد یہ ہے کہ اس کی زندگی شاندار، مؤثر اور بہتر ہوجائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصدِ عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے اور جو شے زندگی کو جس قدر فراوانی عطا کرے اُسی قدر اعلیٰ اور اشرف خیال کی جائے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوتِ ارادی کو بیدار کردے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ

(باقی آخر میں)

[1] السماع والرقص ۔ امام ابن تیمیہ

"بیمۂ زندگی"

ممتاز علمائے مصر کی نظر میں

(ترجمہ: مولانا فضل الرحمٰن، ایم۔اے۔ بی۔ٹی۔ ایچ (علیگ)، ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

"لواء الاسلام" قاہرہ کا ایک دینی، ثقافتی اور اجتماعی ماہنامہ ہے جو ۱۲ سال سے شائع ہو رہا ہے، اس ماہنامہ میں مصر کے بہترین علماء کے مقالے شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ کی طرف سے ایک مجلس مذاکرہ، اہم اسلامی مباحث پر گفتگو کرنے کے لیے ہر ماہ منعقد کی جاتی ہے جس میں مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے علماء بحث میں آزادانہ حصہ لیتے ہیں، اس تمام بحث کو ہر ماہ، "ندوۃ لواء الاسلام" کے مستقل عنوان کے تحت ماہنامہ میں شائع کر دیا جاتا ہے۔

زیر نظر مباحثہ جو لواء الاسلام جلد ۸ نمبر ۱۱ بابت رجب ۱۳۷۴ھ / مارچ ۱۹۵۵ء سے ترجمہ کیا گیا ہے اور رسالہ کے صفحہ ۸۰۷ سے ۸۲۰ تک پھیلا ہوا ہے، بیمہ زندگی کے اہم موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ ترجمہ کی پیشکش کا بڑا مقصد، برصغیر ہند و پاک کے ماہرین شریعت اسلامیہ کے لیے فکر انگیزی کا سامان اور دوسرے حضرات کے لیے معلومات فراہم کرنا ہے کیونکہ بیمہ کا موضوع دوسرے بہت سے جدید مسائل کے مانند دینی نقطۂ نظر سے فنی انداز پر تشریح کے لحاظ سے ابھی تک بے حد تشنہ ہے، اگر برصغیر کے صاحبان علم بھی موجودہ سیاسی و معاشی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں شریعت اسلامیہ کا موقف واضح کرنے کی کوشش فرمائیں تو شاید بہت سے لوگوں کے لیے رہنمائی کا باعث بن سکیں گے[1]۔ مزید یہ کہ

[1] اس سلسلے کی ایک کوشش نعیم صدیقی صاحب کا مقالہ بعنوان "بیمۂ زندگی یا لائف انشورنس (اسلامی نقطۂ نظر سے)" ہے جو ترجمان القرآن لاہور مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی جلد ۵۰ عدد ۴ بابت ماہ شوال ۱۳۷۷ھ / ماہ جولائی ۱۹۵۸ء

اگر ندوۃ لواء الاسلام کی طرح، ماہانہ مباحثوں کے منعقد کرنے اور ان کو شائع کرنے کا اقدام ہند و پاک کے کسی مجلّہ کی طرف سے ہو سکے تو یہ نہ صرف عامۂ مسلمین بلکہ دیگر اہلِ علم و فضل حضرات کے لیے جدید مسائل کے افہام و تفہیم کے نقطۂ نظر سے ایک مفید سلسلہ ثابت ہو سکے گا۔ (مترجم)

۸ رجمادی الاخر ۱۳۷۴ھ مطابق یکم فروری ۱۹۵۵ء بروز منگل بوقت شام ندوۃ لواءِ الاسلام، کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسبِ ذیل حضرات نے حصہ لیا۔

احمد حمزہ، الحاج امین الحسینی مفتی فلسطین، محمد المفتی الجزائری، عبدالعزیز علی، خطاب محمد، امین عز العرب، منصور رجب، صبری عابدین، محمد علی الحومانی، حنفی احمد، سلیمان النقاد، مصطفیٰ ربیع، یوسف الحدیدی، محمود سلیمان، مصطفیٰ زید، عبدالفتاح شلبی، محمد سابق۔

نیز اساتذہ، عبدالوہاب خلاف، محمد البنا، محمد ابوزہرہ، عبدالوہاب حمودہ، عبدالحلیم بسیونی، محمد توفیق عریہ، محمد کامل البنا، محمد علی شتا۔

موضوعِ بحث "بیمہ زندگی" تھا۔

بحث کا آغاز محمد کامل البنا نے کیا، آپ نے فرمایا:

ان کمپنیوں کے بارے میں مجلس کی کیا رائے ہے جو لوگوں کے ساتھ اس شرط پر معاہدہ کرتی ہیں کہ وہ ایک معینہ رقم، ایک معینہ مقررہ مدت تک، ان کمپنیوں کو ادا کرتے رہیں گے جس کے عوض میں اُن لوگوں کی زندگی بیمہ شدہ سمجھی جاتی ہے گی، بایں معنی کہ اگر وہ بیمہ شدہ شخص، اس مقررہ مدت تک بقیدِ حیات رہتا ہے تو وہ کمپنی اس کو، ورنہ اس کے انتقال ہو جانے کی صورت میں، اس شخص کو جسے وہ بیمہ دار بحالتِ مرگ نامزد کر دے ایک مقررہ

۴۔ صفحہ ۲۲ - صفحہ ۵۴، میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے مسئلہ زیر بحث کا جائزہ، معاشی و اسلامی نقطۂ نگاہ سے لینے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیکھیے، امداد الفتاویٰ از مولانا اشرف علی تھانوی جلد سوم، صفحہ ۴۲، ۳۷ تا ۳۹ و فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اول و دوم، امداد المفتیین باب الربوٰ والقمار ص ۱۵۱ (مترجم)

رقم ادا کرے گی۔ یہ ادائیگی یک مشت بھی ہو سکتی ہے اور بالاقساط بھی۔ زندگی کے علاوہ یہ کمپنیاں حوادث مثلاً قتل، آتش زدگی، ایکسیڈنٹ، وغیرہ کے لیے بھی بیمہ کرتی ہیں۔

استاذ حنفی احمد: سوال کی مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ بیمہ کار کمپنیاں عموماً بیمہ داروں یا بیمہ داری کے خواہشمند حضرات کو ایک معینہ فی صد سالانہ رقم بطور منافع، ان اقساط کے عوض میں جو وہ کمپنی کو ادا کر رہا ہے، پیش کرتی ہیں۔ اس صورت میں اقساط کی مجموعی مقدار مقررہ شدہ مدت کے اندر اتنی ہو جاتی ہے جتنی اس کمپنی کو بیمہ دار کی موت یا مقرر شدہ مدت کے اختتام کے بعد اس شخص کے نامزد کردہ یا اس شخص کو ادا کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بیمہ دار اس بات سے انکار کرتا ہے کہ ادا کردہ اقساط کی مالیت پر سالانہ منافع لے تو اس صورت میں ان اقساط کی مجموعی مالیت جو اس کے ذمہ واجب الادا ہیں۔ زرِ بیمہ سے کم رہتی ہے، بالفاظ دیگر یہ منافع اس بات کا معاوضہ ہوتا ہے کہ کمپنی ان سالانہ اقساط پر یک دم تصرف کرنے کی مجاز ہو۔

استاذ ابن عز العرب: اسی طرح بیمہ دار کو ایک مقررہ مدت گزرنے کے بعد یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ بیمہ کمپنی سے، بنکوں کے مقابلہ میں، کم مقدارِ منافع پر قرض لے سکے۔

استاذ عبد الوہاب حمودہ: پیش کردہ صورتِ حال گویا اس بات کو متقاضی ہے کہ بیمہ دار، ادا کردہ رقم سے زیادہ پر قبضہ کرنے کا حقدار ہو جاتا ہے۔

استاذ سلیمان العقادہ: بیمہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بیمہ دار، مدتِ بیمہ کے اختتام تک اقساط ادا کرتا رہے اور زرِ بیمہ کی کل مقدار اتنی ہی ہو جتنی بغیر منافع کے مجموعی اقساط کی مقدار ہوتی ہے۔ اس بیمہ سے استفادہ صرف حالتِ مرگ میں ہو سکتا ہے۔

استاذ عبد العزیز علی: بعض کمپنیاں زندگی کے بیمہ دار کو اس کی ادا کردہ رقم پر ایک مقررہ منافع دینے کے بجائے اپنے عمومی منافع کے تناسب سے منافع ادا کرتی ہیں۔

الحاج یوسف الحدیدی: بعض کمپنیوں کا طریقہ یہ ہے کہ بیمہ دار کے انتقال کے

بعد اس کے نامزد کردہ شخص کو پورا زرِ بیمہ یک مشت ادا کرنے کے بجائے، ایک طویل مقررہ مدت تک اس کو ماہانہ رقم ادا کرتی رہتی ہیں۔

استاذ عبدالوہاب خلاف : بیمۂ زندگی (التأمین علی الحیاۃ) کے نام سے مروجہ نظامِ کار کے متعلق اپنی معلومات کے پیشِ نظر میرا خیال یہ ہے کہ

(۱) یہ نظامِ کار نہ تو زندگی کی کوئی ضمانت دیتا ہے اور نہ اس کا مقصود جان کی حفاظت، عمر میں اضافہ یا تقدیر کی مخالفت یا مقابلہ ہے، اس کی غرض وغایت صرف آدمی کے آمدنی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا اور اسے جمع رکھنا ہے تاکہ اس سے آہستہ آہستہ ایک ایسی رقم بن جائے جس سے قسط گزار، اگر اس کی زندگی اُن اقساط کی ادائیگی کی تکمیل تک وفا کرے، خود منتفع ہو سکے اور اگر اس کا پیمانۂ حیات، ادائیگی کی تکمیل سے قبل ہی لبریز ہو جاتا ہے تو کوئی دوسرا نامزد کردہ شخص اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ یہ صرف سرمایہ جمع کرنے کا ایک اختیاری معاملہ ہے جس کا منتہائے مقصود اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی اور مال کا کوئی حصہ پس انداز کر سکے تاکہ وہ سن رسیدگی کے وقت خود اس کے یا اس کی ناگہانی موت کی صورت میں اس کے وارثین یا اس کے مختار کار کے کام آ سکے۔ اس نظامِ کار کو "تامین علی الحیاۃ" کے نام سے موسوم کرنا ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ یہ تو محض پس اندازی واندوختگی اور قسط گزار اور اس کے ورثاء کے لیے زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا نظامِ کار ہے۔ جو لوگ اس پر یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تقدیر سے مفر نہیں اور تقدیر کے آگے تدبیر کی نہیں چلتی وہ اس کے غلط نام سے دھوکا کھا کر، اس کی حقیقت پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۲) یہ نظامِ کار عقود جدیدہ میں سے ہے۔ قرآن وسنت میں اس کے بارے میں کوئی نصِ صریح قطعی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ صرف اجتہاد رہ جاتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ شریعت کے عمومی قواعد کو اس نظام پر منطبق کر کے دیکھا جائے اور اس کو ایسی نظیر پر قیاس کیا جائے جس کے حکم کے بارے میں نص وارد

ہوتی ہو یا اس سے حاصل ہونے والے مصالح اور اس کے ذریعے دفع ہونے والے مفاسد کا جائزہ لیا جائے یا ان طریقوں کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ استعمال کیا جائے جو شریعت نے ایسے معاملات میں اجتہاد کرنے کے لیے مشروع کیے ہیں جن کے بارے میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔ ایسے تمام معاملات کے بارے میں جو بیک وقت مدنی اور دینوی دونوں نوعیتوں کے حامل ہیں اور اور جن کے بارے میں شریعت میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو، اجتہاد کا اساسی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ایسے سارے معاملات مباح ہیں جو لوگوں کے لیے نفع محض کا سبب بنتے ہوں یا ان میں نفع و ضرر دونوں پائے جاتے ہوں لیکن ان کا نفع ان کے ضرر سے زیادہ ہو، کیونکہ تشریع احکام سے شریعت کا مقصد، انسانوں کے لیے حصولِ مصالح اور دفعِ ضرر کے سوا کچھ نہیں،[1] برخلاف اس کے جن معاملات کی نوعیت یہ ہو کہ ان پر ضررِ محض مترتب ہوتا ہو یا ضرر و نفع دونوں مترتب ہوں لیکن ضرر ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہو تو وہ ناجائز ہیں۔ اس اصول کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

[1] انحطاط کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ وہ جب کسی قوم پر چھا جاتا ہے تو اس کے اندر بے اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم زندگی کے ہر معاملے کو اس کے دینی فائدے اور اخروی اجر کے نقطۂ نظر سے دیکھیں لیکن اس دورِ زوال میں اب ہم ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے معیار سے ماپنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ تشریعِ احکام سے شریعت کا مقصد انسانوں کے حصولِ مصالح اور دفعِ ضرر ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رہے کہ حصولِ مصالح سے مغرب کی "مادیت پرستی" کے لیے جواز تلاش کرنا صحیح اور درست نہیں۔ اس اصول (حصولِ مصالح اور دفعِ ضرر) کی اگر کوئی اہمیت ہے تو اس دائرہ میں ہے جس دائرہ میں سارا مدارِ بحث قیاس یا عرف و مصلحت پر ہو۔ باقی رہے وہ امور جو کتاب و سنت یا اجماع سے ثابت ہیں تو وہاں اس اصول کو کسی طرح رہنما نہیں بنایا جا سکتا۔ بیمہ میں قمار اور سود دونوں کے عناصر شامل ہیں اس لیے اس معاملہ کو استحسان یا مصلحت مرسلہ کے دائرہ میں لانا صریح زیادتی ہے اگر شریعت کا منشا یہ سمجھ لیا جائے کہ محض مصلحت اور مفاد کو سامنے رکھ کر جس چیز کو انسان چاہے حلال قرار دے اور جس چیز کو چاہے حرام ٹھہراتا چلا جائے تو یہ شریعت کی پیروی نہیں بلکہ اس سے بغاوت ہے۔ (ع - ح - ص)

فرمان "لاضرر ولا ضرار"[1] ہے۔

(۳) بیمہ کاری کا نظام، دوسرے شرعی عقود کے مقابلہ میں، عقدِ مضاربت (جسے اکثر فقہا قراض بھی کہتے ہیں) سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے، اسی کے تحت رکھے جانے کے لائق ہے۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ میں مضاربت، منافع میں شرکت کے ایک ایسے عقد کو کہتے ہیں جس میں ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے اور دوسری جانب سے محنت۔ صورت زیر بحث (بیمہ زندگی) میں سرمایہ ان قسط گزاروں کی جانب سے ہوتا ہے جو اقساط کی ادائیگی کرتے ہیں اور محنت اس کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے جو اس سرمایہ کو کھپاتی ہے اور منافع، کمپنی اور قسط گذاروں میں آپس کے معاہدہ کی رو سے تقسیم ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر دو اعتراض کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ مضاربت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ سرمایہ کار اور محنت کار کے درمیان منافع نسبت کی بنیاد پر طے ہو اور دونوں میں سے کسی فریق کے لیے منافع کی کوئی معین مقدار مشروط نہ ہو لیکن بیمہ کے معاملہ میں قسط گذار کو فی صد کے حساب سے منافع کی ایک معین مقدار ملتی ہے جس کی وجہ سے مضاربت صحیح نہیں رہتی۔

۲۔ کمپنی جو اس سرمایہ کو کھپاتی ہے وہ اس بات کی پابند نہیں ہوتی کہ اس سرمایہ کو شریعت کے مباح کردہ مواقع میں یا جائز طریقوں سے ہی استعمال کرے کیونکہ وہ جہاں اس سے تجارت کرتی ہے یا عمارات بناتی ہے اور بہت سے دوسرے جائز کام کرتی ہے وہاں وہ منافع پر قرض بھی دیتی ہے جو سودی کاروبار ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب الاستاذ الامام محمد عبدہ کی سورۂ بقرہ کی آیاتِ ربا کی وہ تفسیر ہے جس کی عبارت یہ ہے[2] "لا یدخل فی الربا المحرم بالنص الذی لاشک فی تحریمه من یعطی

[1] اس حدیث کو ابن ماجہ اور دارقطنی وغیرہ نے بطور مسند اور امام مالکؒ نے موطا میں بطور مرسل روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سنن ابن ماجہ احکام ۱۷، موطا اقضیۃ ۳۱، مسند احمد بن حنبل ۳۲۷/۵ تحقیق احمد محمد شاکر۔ مستدرک حاکم، و بیہقی و دارقطنی من حدیث ابی سعید الخدری۔ نیز الاشباہ والنظائر لابن نجیم مع شرح الحموی القاعدۃ الخامسۃ الضرر یزال۔ (مترجم)

[2] تفسیر المنار تالیف سید رشید رضا ۱۱۶/۳ طبعۃ ثانیۃ۔ (مترجم)

آخر مالاً يستغله ويجعل له من كسبه حظاً معيناً، لان مخالفة اقوال الفقهاء فی اشتراط ان يكون الربح نسبياً لاقتضاء المصلحة ذالك لاشئ فيها، وهذه المعاملة نافعة للعامل ورب المال معاً، اما الربا المحرم ففيه اضرار بواحد بلا ذنب غير الاضطرار، ونفع لواحد بلاعمل، ولايمكن ان يكون حكمهما فی عدل الله واحداً ولايمكن ان يقول عاقل عادل ان النافع يساوی الضار فی حکمۃ۔ (اس سود کے تحت جس کی حرمت منصوص اور شک و شبہ سے بالاتر ہے، یہ چیز داخل نہیں کہ ایک شخص کسی دوسرے کو پیداواری اغراض کے لیے سرمایہ دے اور اس شخص کی کمائی میں سے اپنے لیے ایک معتبہ مقدار مقرر کرے کیونکہ فقہاء کے ان اقوال کی مخالفت جن میں انھوں نے برنبائے مصلحت مضاربت میں منافع کا ازروئے نسبت طے ہونا شرط قرار دیا ہے کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ وجہ یہ کہ اس معاملہ میں سرمایہ کار اور محنت کار دونوں ہی کا فائدہ ہوتا ہے برخلاف حرام کردہ ربا کے کہ اس میں ایک فریق کو محض تنگدستی اور مجبوری کے جرم کی بنا پر ضرر پہنچتا ہے اور دوسرے کو بلا کسی محنت کے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ان دونوں صورتوں کا حکم اللہ کے انصاف کے سامنے یکساں ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی عقل مند اور منصف مزاج یہ کہدے کہ نفع مند اور نقصان دہ چیزوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہیے)۔

مزید برآں یہ مسئلہ کہ منافع مقررشدہ مقدار کی صورت میں طے نہ ہو بلکہ ازروئے نسبت طے کیا جائے، اجماعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس میں بعض فقہاء نے اختلاف کیا ہے[1]۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ منافع پر قرضہ لینے کی حرمت، سدِّ ذریعہ[2] کی قبیل سے ہے اور یہ امر علماء کے نزدیک ثابت شدہ ہے کہ جو چیز سدِ ذریعہ کے طور پر حرام قرار دی جاتی

---

[1] استاذ خلاف کی یہ رائے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں مختلف فیہ ہے، میرے نزدیک صحیح نہیں، مذاہب اربعہ کی معتبر کتب سے اس میں کسی اختلاف کا حال نہیں معلوم ہوتا (مترجم)

[2] سد ذریعہ کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: ارشاد الفحول للشوکانی ص ۲۱ طبعہ صبیح، الفروق للقرافی جلد ۲ ص ۳۹ تا ص ۴۲ طبعہ تونسیہ ۱۳۰۲ھ، اعلام الموقعین لابن القیم جلد ۱ ص ۲۰۳، التوسل والوسیلہ لابن تیمیہ، طبعۃ المنار ص ۱۶

وہ حاجت کے وقت جائز ہو جاتی ہے۔ فقہاء کا قول ہے کہ حاجات بعض محظورات کو جائز کر دیتی ہیں۔ فقہاء حنفیہ میں سے صاحب الاشباہ والنظائر کا قول ہے "ومن ذالک الافتاء بصحة بیع الوفاء[1] حین کثر الدین علی اھل بخاری، وھکذا المصر، وسموہ بیع الامانة وتجویز الاستقراض بالربح للمحتاج (بیع الوفا کی صحت کا فتویٰ جب کہ اہل بخاری پر قرض بہت زیادہ ہو گیا تھا، اسی قبیل سے ہے جیسا کہ مصر میں بھی ہوا کہ اس کا نام بیع الامانة رکھا گیا اور محتاج کو منافع پر قرض لینے کا جواز اسی قبیل سے ہے۔)

میری رائے یہ ہے کہ یہ نظامِ کار جس کا نام بیمۂ زندگی ہے، عقدِ مضاربت ہے اور عقد صحیح ہے جو چندہ گزاروں اور کمپنی دونوں کے لیے نفع بخش ہے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرہ کے لیے بھی اس میں نہ تو اضرار (نقصان پہنچانا، ضرر رسانی) لازم آتا ہے اور نہ بغیر حق کے کسی کا مال کھا جانا۔ اور یہ درحقیقت اندوختگی، تعاون اور پس اندازی ہے تاکہ سن رسیدگی کے وقت چندہ گزار کے کام آئے اور اس کی مرگِ ناگہانی کی صورت میں، اس کے ورثاء کی صلاحِ کار کا سبب بنے۔ شریعت صرف نقصان دہ چیز کو حرام کرتی ہے یا اس چیز کو جس کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہو، مختصر یہ کہ یہ ایک جائز تصرف ہے۔ اگر میری یہ رائے صحیح ہے تو محض توفیقِ ایزدی ہے ورنہ بصورتِ دیگر عقل کی لغزش۔

استاذ محمد البنا: بیمہ کمپنیوں کے بارے میں مجلس کے سامنے جو سوال رکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے۔

(۱) یہ معاملہ ان عقود میں سے نہیں جو شریعت اسلامیہ کے واسطے سے ہمارے

---

[1] بیع الوفاء کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الجزء الاول من الفتاویٰ البزازیة طبع علی ہامش الفتاویٰ الہندیة، نوع فیما یتصل بالبیع الفاسد ص۴۰۴ تا ص۴۲۳ المطبعة الامیریة ۱۳۱۰ھ۔ بیع الوفا کو بیع الامانة (زیلعی) اور الرہن المعاد (الملتقط) بھی کہتے ہیں۔ بیع الوفا کا ذکر تین مواضع میں آتا ہے مثلاً البزازی نے البیع الفاسد میں، قاضی خاں نے خیار النقد میں، اور زیلعی نے الاکراہ میں ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں بزازی نے آٹھ اقوال نقل کیے ہیں۔ (مترجم)

پاس پہنچے ہیں بلکہ ایک بالکل جدید عقد ہے جس کی نظیر اس سے قبل نہیں پائی جاتی۔ ایسے جدید عقود کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ اجتہاد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس کو کسی شرعی عقد سے ملحق کیا جاتا ہے اور اگر غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ کسی عقد سے موافقت یا مشابہت رکھتا ہے اور کوئی ایسا جوہری اور بنیادی فرق، ان دونوں کے درمیان نہیں پایا جاتا جو حکم پر اثر انداز ہو سکے تو اس کی اباحت کا حکم دے دیا جاتا ہے ورنہ عدمِ اباحت کا۔

(۲) شریعتِ اسلامیہ میں پائے جانے والے عقود کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ کا عقد، کسی ایسے عقد سے نہ ایسی مشابہت رکھتا ہے اور نہ موافقت کہ جس سے اُن دونوں پر ایک ہی حکم کے اجراء کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بات دیکھ کر کہ عقدِ مضاربت میں ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے اور دوسری جانب سے محنت اور ایسا ہی بیمہ میں ہوتا ہے، بعض حضرات نے بیمہ کو مضاربت سے ملحق کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم میں اس رائے کے خلاف ہوں کیونکہ بیمہ اور مضاربت میں کئی جوہری فرق موجود ہیں۔ مضاربت کی شرط یہ ہے کہ منافع معین نہ کیا جائے بلکہ از روئے نسبت طے کیا جائے، یہ ایسا اساسی فرق ہے کہ اس سے کسی قیمت پر اعراض ممکن نہیں اور نہ اس شرط کے بغیر ایک کا قیاس دوسرے پر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں الاستاذ الامام محمد عبدہ سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے منافع کی مقدار کے معین ہونے کو جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ فقہاء کے وہ اقوال جن میں منافع کو از روئے نسبت طے ہونا مضاربت کی شرط بتایا گیا ہے بر بنائے مصلحت ہیں اور ان اقوال کی مخالفت کوئی ایسی بات نہیں ہے تو یہ استاذ الامام کا ذاتی اجتہاد ہے اور جیسا کہ قائل کو خود اقرار ہے اقوالِ فقہاء کے قطعی خلاف ہے تو عرض یہ ہے کہ استاذ امام کی مخالفت، بہ نسبت مختلف ادوار کے فقہاء کی ایک کثیر تعداد کی مخالفت کے، آسان ہے۔ لیکن اگر استاذ الامام کے اس قول کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی بات جہاں تھی وہیں رہتی ہے اور بیمہ اور مضاربت کے درمیان

مشابہت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، کیونکہ جو شخص منافع کے معیّن کرنے کے جواز کا قائل ہو گیا، اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ خسارہ کی تعیین کے وجوب کا بھی قائل ہو کیونکہ یہ تو کسی حالت میں ممکن نہیں کہ کوئی اس بات کا قائل ہو کہ سرمایہ کار کو ہمیشہ فائدہ ہی ہونا چاہیے حالانکہ بیمہ میں بیمہ دار پر اس نقصان کی کوئی ذمّہ داری نہیں ہوتی ہے جو کمپنی کو لاحق ہو اور یہ وہ چیز ہے جو بیمہ اور مضاربت میں شدید قسم کا فرق کر دیتی ہے۔

(۳) بیمہ کو مضاربت سے ملحق کرنے والے حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس پر صرف دو اعتراض وارد ہوتے ہیں، ایک منافع کا معین ہونا جس کا جواب شیخ محمد عبدہٗ کی تفسیر کے ذریعہ دیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ جو کمپنی ان اموال میں تصرّف کرتی ہے۔ اس کے لیے لازمی نہیں کہ وہ اسے شریعت کے جائز کردہ مواقع پر اور مباح طریقوں سے استعمال کرے کیونکہ جہاں وہ تجارت، بناء عمارات اور بہت سے جائز کام کرتی ہے، وہیں وہ منافع پر قرض بھی دیتی ہے جو تعامل یا لربا ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ منافع کی شرط پر قرض لینا، سدِّ ذریعہ کے طور پر حرام کیا گیا ہے اور علماء کے نزدیک سطے شدہ امر ہے کہ سدِ ذریعہ کے طور پر جو چیز حرام کی جاتی ہے وہ حاجت کے وقت جائز ہو جاتی ہے کیونکہ حاجات بعض محظورات کو جائز کر دیتی ہیں، اس سلسلہ میں بعض نصوص کو بھی اس موقف کی تائید میں سمجھ کر پیش کیا گیا۔

میری رائے میں ان نصوص کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کی تطبیق مسئلہ زیرِ بحث پر مشکوک ہے کیونکہ اس رائے کے حاملین نے بیمہ اور مضاربت کے درمیان کے اس جوہری فرق کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی بنا پر ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرق یہ ہے کہ مضاربت میں اگر نقصان ہو تو وہ نقصان سرمایہ کار کو برداشت کرنا پڑتا ہے برخلاف اس کے بیمہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ پھر یہ کہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار کا انتقال ہو جائے تو وارثین کو صرف اتنا ہی سرمایہ مل سکتا ہے جو ان کے مورث نے محنت کار کے سپرد کیا ہے برخلاف اس کے بیمہ میں اگر بیمہ دار کا انتقال ہو جائے تو اس کی موت کے بعد جس شخص کو

زر بیمہ ملنے والا ہے، ایک بڑی رقم یعنی زر بیمہ کا حقدار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایسا مخاطرہ ہے جس سے شارع علیہ السلام نے روکا ہے کیونکہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں، کیونکہ بعض اشخاص تو ایسے نکلیں گے جنہوں نے آج بیمہ کرایا اور کل ان کے کسی وارث نے اس خطیر رقم پر قبضہ کر لیا اور بعض ایسے اشخاص ہوں گے جو بیمہ کرانے کے ایک طویل مدت بعد اس رقم پر قبضہ کرنے کے حقدار ہوں گے۔ اس صورت کے متعلق یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی شرعی عقد میں وارد نہیں ہوئی۔ ان فروق کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا قیاس باطل ہے اور کوئی شخص اس عقد کے جواز کا قائل ہے تو اسے شریعتِ اسلامیہ کے کسی دوسرے عقد کے ساتھ اس کی مشابہت تلاش کرنا چاہیے لیکن میرا ذاتی خیال اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ایسے عقدِ شرعی کا جو بیمہ سے مشابہت رکھتا ہو، ملنا محال ہے۔

(۴) خلاصۂ بحث یہ ہے کہ میری رائے میں بیمہ کا معاملہ شرعاً ناجائز ہے پھر یہ کہ ایسا معاملہ جس میں علماء کی آراء، اس حد تک مختلف ہوں، اس کے بارے میں زیادہ محتاط طرزِ عمل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "دع ما یریبک الی ما لا یریبک"[1] کے پیشِ نظر اس سے اجتناب کیا جائے۔ بہر حال میری یہ رائے اگر شارع کے مقصود کے موافق ہے تو عنایتِ ایزدی ہے اور اگر میں نادانستہ شریعت کی عطا کردہ وسعت کو تنگ کر رہا ہوں تو یہ میرا قصور ہے۔ مجھے اس رائے پر آمادہ کرنے والی چیز محض مشتبہات سے پرہیز کرنے کا جذبہ ہے کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو مشتبہات سے پرہیز کرتا ہے وہ اپنے دین و آبرو کو صحیح و سلامت بچا لے جاتا ہے۔

استاذ صبری عابدین: میں استاذ الینا کی تائید کرتا ہوں کہ بیمہ کو مضاربت سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے یہ میسر اور قمار سے زیادہ مشابہ ہے۔ کیوں؟ اسے یوں سمجھیے کہ ایک شخص پہلی قسط، دس پونڈ کی ادا کرنے کے بعد، اگلے دن اس عالم فانی سے

[1] بخاری بیوع ۳، ترمذی، قیامۃ ۶۰، مسند احمد ۱۵۳/۳ (مترجم)

سدھار جاتا ہے اور اس کی اولاد ایک ہزار پونڈ کمپنی سے وصول کر لیتی ہے۔ یہ آخر کس حق کے ذریعہ ہے اور اس دستور اور قمار میں کون سا فرق ہے۔ سوالات کے متعلق استاذ حنفی احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ کمپنی بیمہ دار کو معینہ منافع بھی دیتی ہے، یہ منافع ربا ہے اور ربوی معاملات بالاتفاق ممنوع ہیں۔ لہٰذا میری رائے میں اس میں نہ صرف ربا کا شبہ ہے بلکہ صریح ربا ہے۔ ایسی چیز کو جائز قرار دینا جس کے بارے میں کوئی نصِ شرعی موجود نہ ہو، کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے کاروبار کی تمام تفاصیل معلوم کرنے سے پہلے بعجلت تمام اس کے جواز کا فیصلہ کر دیا جائے۔ ہم لوگوں کو ان تمام کارروائیوں کا پورا علم نہیں جو یہ کمپنیاں عمل میں لاتی ہیں۔ ہمیں کمپنیوں کی شرائط میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جن میں ربا موجود ہے۔ نہ معلوم، استاذ خلاف کا ردِ عمل یہ معلوم کر کے کہ ان شرائط میں صریح ربا موجود ہے کیا ہوگا پھر یہ سیدھی بات ہے کہ شرائط کا وضع کرنا اور عوام پر ان کا نافذ کرنا کمپنیوں کا حصّہ ہوتا ہے لہٰذا شریعت کے اس حق کی حفاظت کے پیشِ نظر جو ہمارے پاس امانت ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فتویٰ دینے میں ہم کو انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے اور جب کہ یہ بات ہماری استطاعت سے باہر نہیں کہ کمپنیوں کی شرائط کو سامنے رکھ کر بے لاگ فتویٰ صادر کریں تو ایسا ہی کرنا بھی چاہیے۔

استاذ عبدالوہاب حمودہ: میری رائے یہ ہے کہ اگر کچھ ایسی بیمہ کمپنیاں ہوں جو نفع اور قرضے نہ دیتی ہوں اور نہ اپنے راس المال میں ایسے منافعوں کے ذریعے اضافہ کرتی ہوں جو شریعت کی نظر میں ناجائز ہیں تو اس طرح کی بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہے اور فقہاء نے جو منافع کو نسبت کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی شرط لگائی ہے، اس سے محمد عبدہٗ کی رائے کے موافق صرفِ نظر کی جا سکتی ہے۔

استاذ منصور رجب: بیمہ ان جدید معاملات میں سے ہے جو زمانہ کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جن کے بارے میں کوئی نصِ قطعی وارد نہیں ہوئی ہے۔ اصولِ فقہ کا یہ

متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جس مسئلہ میں نصِ قطعی موجود نہ ہو، اس میں اجتہاد واجب ہے۔ معاملہ زیرِ بحث میں اجتہاد دنیاوی مصلحت کی طرف راجع ہو رہا ہے جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے "انتم اعلم بامور دنیاکم"[1] لہٰذا ایسے عقود کی اباحت سے کوئی شے مانع نہیں ہو سکتی اگر ان میں کوئی یقینی مصلحت پائی جاتی ہو بالخصوص جب اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ وہ خطرات جنھوں نے آج مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور انھیں شدید ضرر میں مبتلا کر دیا ہے، امتِ مسلمہ کی مادی قوت کے وسائل سے اعراض کرنے کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں اور یہ یقینی بات ہے کہ بیمہ مغربی اقوام کے نزدیک مادی قوت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

الشیخ عبد العلیم بسیونی، استاذ خلاف نے شیخ محمد عبدہ سے نقل کیا کہ مضاربت میں منافع کی عدمِ تحدید کی شرط فقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے ورنہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں اس کی کوئی اصل نہیں ملتی اور اسی وجہ سے انہوں نے فقہاء کے برخلاف اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ مضاربت میں نفع کو معین کر سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرط خود مضاربت کی طبیعت سے ماخوذ ہے کیونکہ مضاربت ایک تجارتی شرکت ہے اور تجارت میں بالطبع کمائی، خسارہ اور منافع غیر محدود و غیر معین ہوتے ہیں، لہٰذا فقہاء نے منافع کی عدم تعین کو شرط ٹھہرا کر، درحقیقت مضاربت کی طبیعت کو واضح و مُتاکّد کر دیا ہے۔ مضاربت و بیمہ کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت ایسی تجارتی شرکت ہے جس کی طبیعت میں کمائی، خسارہ اور غیر معین منافع ہے برخلاف اس کے بیمہ میں، خسارہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اس میں صرف منافع ہے اور منافع بھی مقرر شدہ، اس لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بیمہ اور مضاربت کو ان کی طبیعت کے تضاد اور شرط کی مخالفت کے باوجود شئے واحد قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہرگز قابلِ قبول نہیں کہ مجتہدین کی رائے کو ترک کر دیا جائے اور شیخ محمد عبدہ کی رائے اختیار کر لی جائے۔

---

[1] ابن ماجہ، رہون باب تلقیح النخل ۱۵، مسند احمد ۶/۱۲۳، مسلم فضائل ۱۴۰ (مترجم)

استاذ کامل البنا: میرے نزدیک بیمہ ناجائز ہے اور حرام اور ربا ہی کی ایک قسم ہے۔

استاذ سلیمان العقاد: بیمہ کی شرکت کا حکم معلوم کرنے کے لیے مضاربت اور مخاطرت کے فرق باہمی کو، اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اس کے بعد اگر بیمہ مضاربت قرار پائے تو جائز ہے اور اگر مخاطرت ثابت ہو تو ناجائز۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بیمہ کی شرکت کا معاملہ مخاطرت سے قطعاً علیحدہ ہے۔ بیمہ دار کا معاملہ تو واضح ہے۔ کمپنی کے بارے میں صورت یہ ہے کہ کمپنی بیمہ کے ذریعے جمع کردہ اموال کو نفع آور کاموں میں لگاتی ہے، پھر حاصل شدہ منافع کے ایک حصہ کا ان اموال میں اضافہ کرتی ہے تاکہ اس طرح وہ رقم وجود میں آسکے جو اسے بیمہ داروں کو ادا کرنا ہے۔ یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ بیمہ دار بلا عوض کے رقم حاصل کرتا ہے کیونکہ بیمہ کی شرکت کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس کے شرکت دار اپنے اموال کے ذریعے ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں، اس طرح کہ بعض شرکت دار تو مدت مقررہ کے اختتام تک ادائیگی کرتے رہتے ہیں اور کمپنی اس سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگا کر کثیر منافع حاصل کرتی ہے اور اس میں سے ان لوگوں کو ادا کرتی ہے جو اختتام مدت تک ادائیگی نہیں کر پائے۔ اُن رقوم سے جو ان کمپنیوں کو ادا کی جاتی ہیں اور نفع آور اغراض میں کھپائی جاتی ہیں، فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کمپنی اپنی مرکزیت اور ساکھ قائم رکھنے کے لیے اس کا اعلان نہیں کرتی اور اندر ہی اندر ٹھیک ٹھاک کر کے معین منافع ادا کرتی رہتی ہے جس کی ادائیگی کی برداشت وہ اپنے کاروبار کی مختلف صورتوں اور نوعیتوں کے تحت، خسارہ اور نفع دونوں حالتوں میں کر لیتی ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے یقین ہے کہ بیمہ مضاربت ہی ہے اور اس میں کسی فریق کے لیے مخاطرت نہیں ہے۔

استاذ عبد العزیز علی: میں استاذ محمد البنا کی رائے کی تائید کرتا ہوں۔

استاذ خطاب محمد: میرا خیال ہے کہ زندگی کے بیمہ اور اشیاء تجارت و بحری حمل و نقل کے بیمہ کے درمیان خاص طور سے فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ دینی نقطۂ نظر سے شکوک و شبہات

کی بنا پر، انسان بیمۂ زندگی سے بچنے کی آزادانہ کوشش کر سکتا ہے مگر بیمۂ نقل و حرکت ایسی چیز ہے جس پر اکثر تجار کو بحری نقل و حمل کی صورت میں مجبور ہونا پڑتا ہے کیونکہ مروجہ دستور کے مطابق مرسل الیہ ایسے مال کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جس کا بیمہ مال بھیجنے والے تاجر نے نہ کرایا ہو۔ غالباً ایسی مجبوری کی صورت میں تاجر حضرات کے لیے شرعی مواخذہ سے بچنے کا معقول عذر موجود ہے۔

استاذ حنفی احمد: بعض حضرات نے بیمہ کمپنی کی کچھ خاص صورتیں پیش کی ہیں تاکہ بیمہ کی اباحت و عدمِ اباحت کا حکم ایک مخصوص دائرہ کے اندر بھی معلوم ہو جائے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر بھی درست ہے۔ اب تک بیمہ کی جتنی صورتیں پیش کی گئیں، ان میں سے کسی میں اس کی "واپسی" کی شرط کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یعنی اگر بیمہ دار، عقد بیمہ کو مدت کے اختتام سے پہلے ہی فسخ کرنا چاہے تو جو رقم اس شخص کو واپس ادا کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اس شخص کی ادا کردہ رقم سے کم ہوتی ہے۔ اور اگر فسخ، سال بھر سے پہلے ہی ہو تو اسے کچھ واپس نہیں ملتا، اور اس شخص کی ادا کردہ رقم کے بقایا سے باقی بیمہ دار مستفید ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر میں اسے نہایت اہم سمجھتا ہوں کہ بیمہ کی پالیسیاں مثلاً مصر بیمہ کمپنی کی پالیسیاں سامنے رکھی جائیں۔ بہت مناسب ہوتا اگر ادارہ لواء الاسلام، مصر بیمہ کمپنی کے کسی نمائندہ کو اپنے اجتماع میں دعوتِ شرکت دیتا کیونکہ یہ معاملہ بعض شرائط کی وضاحت و تشریح اور بعض ایسی اشیاء کی تحقیق و تفتیش، جو شرائط میں مُصرح موجود نہیں ہے، چاہتا ہے۔ یہ مشورہ محض اس نقطۂ نظر سے ہے کہ موضوع بحث کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جا سکے تاکہ ندوہ کے جواب کو ایک معتبر اور محترم حیثیت حاصل ہو سکے۔

استاذ مصطفیٰ زید: حقیقت یہ ہے کہ اگر دو چیزیں نہ ہوتیں تو بیمہ کو مضاربت قرار دیا جا سکتا تھا، ایک یہ کہ مضاربت بالطبع نفع اور نقصان، دونوں میں اشتراک کی متقاضی ہے اور بیمہ بالطبع نقصان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، دوسرے یہ کہ فقہاء کے نزدیک یہ بات مضاربت کی شرائط میں سے ہے کہ نفع از روئے نسبت طے ہو اور غیر معین ہو۔ رہی یہ بات کہ بیمہ میں کسی کے اضرار کا کوئی پہلو نہیں، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ عقد کبھی تو بیمہ دار کو نقصان پہنچاتا ہے

اور کبھی کمپنی کو، اگرچہ عملاً کمپنی کا نقصان ایک نہایت ہی نادر الوقوع صورت ہے، کیونکہ وہ مختلف شرائط کے ذریعے اپنا تحفظ پہلے ہی کر لیتی ہے۔ بیمہ دار کا ضرر اس صورت میں ہوتا ہے کہ اگر وہ اقساط کی ادائیگی منقطع کر دے تو کمپنی اسے یا تو بالکل کچھ واپس نہیں دیتی یا اس کی ادا کردہ رقم سے کم واپس دیتی ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر مجھے ان لوگوں کی رائے سے اتفاق ہے جو بیمہ کو ناجائز بتاتے ہیں۔

استاذ محمد ابوزہرہ: کچھ عرصہ ہوا، ایک مجلس ایک اسلامی جمعیت کے دفتر میں منعقد ہوئی تھی جس میں مجھے یاد ہے کہ استاذ محترم خلاف نے بھی شرکت فرمائی تھی، اس مجلس میں ماہرین اقتصادیات نے بیمہ کمپنیوں کے متعلق کچھ بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ بیمہ کی ابتدا، اٹلی کے تاجران بندوق کے درمیان ہوئی، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مالِ تجارت، سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگ دستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا حل یہ نکالا گیا کہ اگر کسی شخص کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک معین رقم ادا کریں، یہ چیز ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ اس کا ہر شخص ایک مقررہ رقم ادا کرے۔ اس کے بعد اس نظام میں مزید ترقی ہوئی اور ملاحوں کی جان کا بھی جو بحری خطرات برداشت کرتے ہیں، بیمہ ہونے لگا، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ بیمہ کی حقیقت تعاونِ محض ہے۔

اگرچہ اس کی اصلیت تعاونِ محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارے کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا کہ یہودیوں نے اس تعاونی نظام کو بھی جس کی بنیاد تعاون علی البر والتقویٰ تھی، ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار اور ربا، دونوں پائے جاتے ہیں، اس طرح تعاون علی البر والتقویٰ کا نظام تعاون علی الاثم والعدوان کے نظام میں تبدیل ہو گیا۔ بہرحال اس وقت ہم بیمہ کی دوسری صورتوں کو چھوڑ کر صرف بیمۂ زندگی کو لیتے ہیں۔ زندگی کا بیمہ اپنی موجودہ صورت و وضع میں یا تو قمار ہوتا ہے جب کہ مدتِ مقررہ کے اختتام کے قبل ہی بیمہ دار کی موت

کی صورت میں اس کے ورثاء میں سے اس کے کسی نامزدہ کو بیمہ شدہ رقم ملتی ہے، یا ربا ہوتا ہے اگر کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ رقم کو مع مزید منافع کے حاصل کرتا ہے۔ بہر حال ربا ہو یا قمار، اس معاملہ میں دو مزید خرابیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو مذاہبِ اربعہ کے کسی فقیہ کے نزدیک صحیح اور جائز نہیں۔ پہلی خرابی یہ کہ اس میں مصلحت غیر کی شرط (اشتراط المصلحة الغیر) پائی جاتی ہے، جسے فقہاء "صفقتان فی صفقة واحدة" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صفقتان فی صفقة واحدة کی ممانعت مروی ہے۔[۵] ممکن ہے اس خرابی سے یہ توجیہ کر کے کہ یہ حدیث حالتِ زیرِ بحث پر مشتمل نہیں ہے، تساہل برت لیا جائے۔ لیکن قطع نظر اس سے دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر بیمہ دار کی وفات ہو جائے تو اس کی رقم، اس کے شرعی ورثاء کے بجائے اس کے نامزد کردہ شخص کو ملتی ہے اور اس صورت میں اسلامی قانونِ وراثت کی صریح مخالفت لازم آتی ہے کیونکہ علمائے شریعتِ اسلامی کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ کسی آدمی کا تمام مال، خواہ وہ بالفعل اس کا کمایا ہوا ہو، خواہ وہ اس مال کے سببِ اکتساب کا مالک ہو، اگرچہ اس کسب کا ثمرہ اس کی موت کے بعد ہی ظاہر ہوا ہو ترکہ سمجھا جائے گا اور اس میں وراثت جاری ہوگی۔ اسی وجہ سے فقہاء کا قول ہے کہ مالِ متجدد جس کے ذریعہ و سببِ حصول کا کوئی شخص اپنی زندگی میں مالک تھا، اگرچہ اس کا اثر اس کی وفات کے بعد ہی کیوں نہ ظاہر ہوا ہو، ترکہ ہی شمار کیا جائے گا مثلاً کسی شخص نے شکار کے واسطے جال لگایا لیکن شکار اس شخص کی موت کے بعد جال میں پھنسا تو فقہاء کے نزدیک اس قاعدہ کے بموجب وہ ترکہ قرار دیا جائے گا، لہٰذا اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ وہ رقم اس شخص کی ملکیت ہوگی جس کو متوفی نامزد کر دے تو شریعت کے قانونِ وراثت کی شرائط کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔

---

[۵] دیکھیے نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ، کتاب البیوع باب البیع الفاسد، نیل الاوطار للشوکانی ۵/۱۲۔ رواہ ابوداؤد و احمد و نسائی و ترمذی و اخرجہ ایضاً الشافعی و مالک فی بلاغاتہ و ادرد الحافظ روایۃ ابن مسعود فی التلخیص و فی مجمع الزوائد و اخرجہ ایضاً البزار و الطبرانی فی الکبیر و الاوسط و فی الباب عند الدارقطنی و ابن عبد البر (مترجم)

سوال یہ ہے کہ اگر بیمہ کاری کا نظام باوجود ان مفاسد کے بہر حال کچھ فوائد پر مشتمل ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ بیمہ کاری کے ایک صحیح شرعی نظام کو یکجا جمع کیا جاسکے ؟ اس کا جواب بہت آسان ہے سو وہ یہ کہ بیمہ کاری کے موجودہ نظام کو پھر انہی بنیادوں پر قائم کر دیا جائے جن پر وہ پہلے کبھی قائم تھا۔ اس طرح کہ تعاونی کمپنیوں کی تکوین عمل میں لائی جاتے جو اُن سارے امور کو انجام دیں جنھیں موجودہ بیمہ کاری کا نظام انجام دیتا ہے اور جس کی بنیاد یہ ہو کہ جو رقم اس تعاون کو ادا کی جاتے وہ حالتِ وفات میں "قسط گذار" کے تمام ورثا میں تقسیم کر دی جائے۔

بیمہ کے عقود جو کمپنیوں اور افراد کے درمیان عمل میں آتے ہیں ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آدمی چندہ گذاری کے ذریعے اس کمپنی کا ممبر ہو جاتا ہے حالانکہ یہ قطعی غلط ہے کیونکہ ان عقود میں ایک فریق کمپنی ہوتی ہے اور دوسرا فریق بیمہ دار ہوتا ہے۔ پھر یہ صورت کیسے ممکن ہے کہ بیمہ گذار کمپنی کا ممبر بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسی کمپنی کے اندر ایک فریق تو وہ خود ہو اور دوسرا فریق کمپنی ہو۔

میری رائے یہ ہے کہ بیمہ کاری اپنی موجودہ صورت میں حرام ہے، اس کے اندر ربا، قمار، قانونِ وراثت سے بغاوت، صفقتان فی صفقۃ، سب ہی موجود ہیں، اگرچہ آخری جزء تطبیق کے نقطۂ نظر سے صرف احتمالی ہے یقینی نہیں۔

مجھے بعض محترم بزرگوں کی چند رایوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ بیمہ اور مضاربت یکساں ہیں، میں نے ہر چند غور و فکر کیا کہ میں بیمہ اور مضاربت کے درمیان مشابہت معلوم کر سکوں مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی مضاربت کی کئی خصوصیات ہیں۔

۱۔ ایک جانب سے سرمایہ ہو اور دوسری جانب سے محنت، نفع دونوں فریقوں کے درمیان تقسیم ہو اور نقصان سرمایہ کار کے ذمہ ہو، بیمہ کاری میں ایسا نہیں ہے کیونکہ

اس میں راس المال صرف منافع کمانا ہے۔

۲۔ منافع کی تقسیم نسبت کی بنیاد پر طے ہو۔ اگر ہم استاذ محمد عبدہٗ کی اس رائے کو تسلیم کر بھی لیں جو معینہ منافع کو جائز بتاتی ہے تو یہ بات محنت کار کے متعلق تو ایک حد تک معقول سمجھی جاسکتی ہے لیکن سرمایہ کار کے متعلق تو اسے کسی طرح معقول کہا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ بر تقدیر مفروضہ یہ عقد اجارہ ہوگا[1] اور یہ بات کہ سرمایہ دار کو اجیر قرار دیا جائے کسی طرح ممکن ہی نہیں؛ وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سرمایہ کار کا حصہ، کسب (کمائی) میں فعلی قرار پائے گا[2]۔ مگر جب کہ واقعتاً وہ کسب کرتا ہی نہیں تو وہ یہ معینہ رقم کس چیز کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے؟ اور یہ صورت مضاربت کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟ کیا عقل و شرع کے نزدیک یہ بات کسی بھی درجہ میں معقول سمجھی جاسکتی ہے کہ محنت کار کی محنت کو سرے سے کالعدم قرار دے دیا جائے؟

۳۔ مضاربت میں جب تک سرمایہ سے عملاً پیداوار نہ ہو جائے اس کی حیثیت کسب یعنی کمائی کی ہوتی ہی نہیں ہے اور بیمہ کی صورت میں جب بیمہ دار کا انتقال، کل سرمایہ کی ادائیگی سے قبل ہی ہوگیا تو اس رقم کے حلال ہونے کی جو اس کے نامزدہ کو حاصل ہوگی کیا صورت ہے اور ایسے معاملہ کو مضاربت کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے۔

استاذ خلاف کی زبان سے یہ بات نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ بیمہ کا منافع اس ربا کی قبیل سے ہے جس کو سدِ ذریعہ کے طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ صورت زیر بحث میں منافع، قرض کی ادائیگی مہلت کے عوض میں ہے اور یہ صاف ربا النسیئہ ہے اور ربا النسیئہ ہی ربا الجاہلیہ ہے۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ قرض کی ادائیگی میں مہلت کے

---

[1] یعنی محنت کار کی حیثیت بجائے مضارب کے اجیر کی ہو اور یہ معینہ منافع اس کی اجرت سمجھی جائے[2] جس میں سرمایہ کار کی حیثیت اجیر کی اور محنت کار کی مستاجر کی قرار پائے گی اور معینہ منافع سرمایہ کار کے اجیر ہونے کی اجرت۔ [2] بوجہ اجیر ہونے کے۔ (مترجم)

عوض، قرض میں اضافہ اور زیادتی ربا ہی کی ایک صورت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس ربا کے متعلق سوال کیا گیا جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے تو آپ نے جواب دیا "ھو الزیادۃ فی الدین" (اس ربا کی حقیقت، قرض پر اضافہ ہے) اس صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ منافع، سدِ ذریعہ کی حرمت کے قبیل سے ہے۔ جب یہ شئے خود ہی حرام لذاتہ ہے تو اس سے بڑا اور کون سا جرم ہو سکتا ہے جس کا ذریعہ بننے کی وجہ سے اس کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اس موضوع بحث کا فیصلہ مجلس کی سابقہ نشست میں ہو چکا ہے اور استاذ خلاف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ پچھلی بحث کے ختم ہو جانے کے بعد پھر نئے سرے سے اس کو شروع کر دیں۔

ابن نجیم صاحب الاشباہ والنظائر سے جو آنجناب نے نقل فرمایا تھا کہ انھوں نے بیع الوفا کو سمرقند کے لوگوں کی حاجت کے پیشِ نظر جائز قرار دیا۔ اس کے جواب کا فقہ کے ہر طالب علم کو معلوم ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا وہ ربا پر مشتمل ہے یا نہیں۔ جو لوگ اس کی حرمت کے قائل ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اس میں قطعی اور صریح ربا پایا جاتا ہے۔ بلکہ ان کی رائے میں اس میں شبہ ربا ہے جو ربا کے مانند ہی عمل کرتا ہے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ "دعوا الربا والریبۃ"[۱] دوسری طرف جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بیع ہے جس میں خیارِ شرط پایا جاتا ہے۔ امام زیلعی نے شرح کنز الدقائق میں یہی فیصلہ کیا ہے۔ فقہاء سمرقند نے اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے ان لوگوں کے قول کو اختیار کیا ہے جو اس سے ربا کی نفی کرتے ہیں۔

آنجناب کی یہ بات کہ حاجتمند کو منافع کی شرط پر قرض لینا جائز ہے موضوع زیر بحث سے غیر متعلق ہے کیونکہ گفتگو سود کھانے والے (آکل الربا) کے بارے میں ہے نہ کہ سود کھلانے والے (موکل الربا) کے بارے میں۔ یہ بات تو شرع اور عقل دونوں کے نزدیک طے شدہ ہے کہ اگر

---

[۱] مسند احمد، مسند عمر حدیث ۲۴۶ ۱/۳۴۴، ابن ماجہ ۲/۲۱ ونقلہ ابن کثیر فی تفسیرہ ۱/۳۲۵ ونسبہ السیوطی ایضاً فی الدر المنثور، ۱/۳۶۵ لابن المنذر۔ (مترجم)

قرض کے حاجت مند کو قرض لینے کی انتہائی شدید ضرورت ہے اور وہ منافع کے بغیر قرض حاصل نہیں کر سکتا تو اس کے لیے قرض لینا حالتِ اضطرار میں مردار کھانے کی طرح جائز ہے۔

کیا بیمہ کرانے والے لوگ بھی اسی طرح کے اضطرار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے دین اور فتاویٰ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور ہم کو عوام الناس کے سامنے ایک ایسی بات رکھنا زیبا نہیں جس میں حرام کو حلال کرنے کی صورت پیدا ہو جاتے اور اللہ کی یہ بات ہمارے اوپر صادق نہ ہو جائے "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھٰذا حلال وھٰذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون"۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ یہ معاملہ امورِ دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے " انتم اعلم باموردنیاکم" (تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہو)۔ اس سلسلہ میں اس حدیث سے سند پکڑنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو یہ چاہتے ہوں کہ دین کے احکام کو صرف عبادات کے مخصوص دائرہ تک محدود رکھ کر باقی جتنے فقہی احکام ہیں ان کو حلال و جائز قرار دیدیا جائے۔ اس حدیث کی حقیقی نوعیت کی وضاحت کے لیے عرض ہے کہ یہ حدیث ان لوگوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تابیر نخل (کھجور کا پیوند لگانے) کے بارے میں سوال کیا تھا۔ آپ نے ان کو اس فعل سے روکا جس کے نتیجے میں اس سال پھل نہیں آئے۔ جب حضورؐ کو صورتِ حال سے مطلع کیا گیا تو آپ نے فرمایا "انتم ادری بشئون دنیاکم" (تم اپنے دنیاوی حالات سے زیادہ واقف ہو) لہٰذا اس حدیث کا انطباق عام تشریعی امور کو چھوڑ کر، صناعت، زراعت اور تجارت کے (تجربی) امور پر کیا جائے گا۔ اس حدیث کے پیچھے پڑے رہنے والوں کے لیے مفید ہوگا کہ اس کے ساتھ ان احادیث کا شمار اور مطالعہ بھی کریں جو معاملات اور اسٹیٹ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور جن پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب کہ اس حدیث کو زراعت، صناعت یا ایسے ہی دوسرے عام اور روزمرہ کے تجربی امور تک محدود رکھا جائے۔

مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی :- موضوع زیر بحث بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ چند روز ہوئے ہندوستان کے ایک عالم نے بھی اس موضوع کے سلسلے میں مجھ سے رجوع کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ وسیع مطالعہ کا طالب تھا جس میں ہمارے پیش نظر بیمہ کی پالیسیاں اور شرائط بھی ہوتیں تاکہ اس پر کافی و وافی بحث ہو سکتی۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے ہم میں سے بعض حضرات نے اس کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے چنانچہ اپنی بحث میں ان صاحبان نے کافی گہرائی کا اظہار کیا لیکن اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ اس موضوع پر بحث و مطالعہ اور گہرائی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

استاذ ابو زہرہ کی تقریر سے قبل میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہود اور اُن کے اس نظام کے اُلٹ دینے کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ فلسطین میں قدس کے مقام پر ایک مقدمہ ایک عدالت کے سامنے پیش ہُوا تھا جس کا صدر اعلیٰ ایک انگریز تھا۔ یہ مقدمہ بیمہ ہی سے متعلق تھا اور اس پر کافی بحث مباحثہ ہُوا۔ معاملہ ایک یہودی کا تھا جس نے ایک گودام کو آگ لگا کر بیمہ کمپنی سے زرِ بیمہ کا مطالبہ کیا تھا تفتیش کے بعد بہت سی دھوکے بازیوں کا انکشاف ہُوا جس میں ایک یہ بھی تھی کہ یہودی نے ایک ماہر اندازہ کار (اکسپرٹ) کو رشوت دی تھی جس کی وجہ سے اس نے تلف شدہ مالیت کا اندازہ ایک لاکھ پونڈ پیش کیا تھا حالانکہ اصل مالیت دس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ دوسری دھوکہ بازی یہ تھی کہ اس یہودی نے گودام کا بیمہ کرانے کے چند ماہ بعد خود اس میں آگ لگا دی تھی، جج نے فیصلہ دیتے وقت کہا "مجھے بیمہ کے ہر اس مقدمہ پر شبہ ہوتا ہے جس میں آتش زدگی اور یہودی دونوں ہوں" اور دعویٰ خارج کر کے یہودی کو حراست میں لے لیا۔ یہودی اخبارات میں اس کے متعلق بہت شور مچا اور جج پر بہت الزامات لگائے گئے۔

جو بحث اس وقت ہوئی، اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بیمہ کے معاملہ میں تھوڑا بہت نہیں بلکہ پورا پورا شبہ موجود ہے اور حضور کا یہ فرمان "دع ما یریبک الی ما یریبک"

ہمارے لیے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ ہم احوط کو اختیار کریں اور شکوک و شبہات سے پرہیز کریں مسلمانوں نے اس قسم کے بہت سے معاملات میں ان کی خوبیوں کے متعلق حُسنِ ظن کے ساتھ حصہ لیا لیکن ان میں پوری طرح مبتلا ہو جانے کے بعد انہیں معلوم ہُوا کہ وہ محض سراب تھا۔ ان کمپنیوں کا غیر ملکی ہونا ہی ایک اچھے خاصے شبہ کی بات ہے۔ پھر ان غیر ملکی کمپنیوں کی موجودگی ہماری سرزمین پر موجودہ شبہ میں ڈالنے والی بات ہے۔ اور ہم سے احتیاط اور کافی غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان کمپنیوں کی تاسیس کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اپنے مصالح و فوائد کے پیشِ نظر قائم کی گئی ہیں نہ کہ ہمارے مصالح و فوائد کے لیے۔ مزید براں یہ کہ ان کمپنیوں کے نظامِ کار میں قمار، ربا، اضرار سبھی کچھ ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر میں احتیاط کا موقف اختیار کرنے کے بارے میں استاذ ایننا کی تائید کرتا ہوں اور آخیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا استاذ ابو زہرہ نے فرمایا، میں اس سے قطعی متفق ہوں کہ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ ایسی تعاونی کمپنیاں وجود میں آئیں جو ہمارے مخصوص مصالح اور مفادات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہوں اور ماہرینِ شریعت اور ماہرینِ اقتصادیات پر مشتمل ہوں تاکہ وہ اسلامی تعاونی کمپنیوں کے لیے ایسا نظامِ کار وجود میں لا سکیں جو اسلامی روح کے موافق ہو اور اس بیمہ کے موجودہ نظام میں جو فوائد پائے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ کر کے ان کو ہماری اقتصادیات اور شریعت کی باہمی ہم آہنگی کے اصول پر اس نظام میں رکھا جا سکے۔

استاذ ابوزہرہ: میں اپنی طبیعت میں بیمہ کے خلاف شدید تنفر کا احساس پاتا ہوں کیونکہ مجھے اس میں تحکم فی القدر کی بُو آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آئندہ زمانہ کے لیے ایک احتیاطی تدبیر ہے اور مستقبل کے لیے احتیاطی تدبیر کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعھم عالۃ یتکففون الناس[1]" (تمہارا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو ایسا محتاج

[1] متفق علیہ، اخرجہ ایضاً احمد والشافعی، اصحاب السنن والبیہقی وصححہ الترمذی (مترجم)

چھوڑ دو کر وہ لوگوں سے سوال کریں)۔ علاوہ بریں ماہرینِ اقتصادیات کا شریعتِ اسلامیہ کے ماہرین سے اس مقصد سے رجوع کرنا زیبا نہیں کہ وہ بیمہ کو حلال قرار دے دیں یا حلت کے لیے کوئی حیلہ نکال دیں، انھیں بجائے اس کے یہ چاہیے کہ علماء سے رجوع کر کے حلال و حرام کی حدیں معلوم کریں اور اس کے بعد اسے اپنا فریضہ سمجھیں کہ غور و فکر کے بعد بیمہ کاری کا ایسا نظام ایجاد کریں جو شریعت سے مطابقت و موافقت رکھتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ماہرینِ اقتصادیات کے لیے یہ کام ایسا کچھ دشوار نہیں ہے۔ خرابی دراصل یہ ہے کہ ہمارے ماہرینِ اقتصادیات شریعتِ اسلامیہ سے کہیں بڑھ کر مغربی اقتصادیاتی اصولوں پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ ان حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جیسے ان کے زعم کے مطابق "ربا" سے مفر نہیں ویسے ہی بیمہ سے بھی مفر نہیں۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ "اے ماہرینِ شریعت تمہارا فریضہ یہ ہے کہ شریعت میں زمانہ کے حالات کے موافق لچک کا سامان فراہم کرو اور اپنی فکر میں وہ لچک پیدا کرو کہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ ہم تم سے فتاویٰ حاصل کریں" یا زیادہ صحیح طور سے یہ سمجھیے کہ یہ لوگ بجائے یہ سمجھنے کے کہ شریعت زمانہ کی محکوم نہیں بلکہ اس پر حاکم ہے اور حقیقی انسانی ارتقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہے، یہ چاہتے ہیں کہ شریعت کو زمانہ کا غلام بنا دیں۔ ماہرینِ اقتصادیات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ پہلے خود شریعت کے حکم کے آگے گردن ڈال دیں اور اس کے بعد بیمہ اور بینکنگ کا ایسا نظام تعمیر کریں جو امتِ مسلمہ کے ہمراہ شریعتِ اسلامیہ کے سائے میں پروان چڑھ سکے۔

میں ایسے علماء کا سخت ترین مخالف ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اُن امور کی کھوج کریں جو ان اقتصادیین کی موافقت میں ہوں، جو اپنے علم الاقتصاد اور نظریات پر، شریعتِ اسلامیہ سے کہیں زیادہ ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ اپنی پاکیزہ و اعلیٰ شریعت کی محافظت و کفالت کے لیے کافی ہے۔

دس کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا مجلس کی کارروائی ختم کی گئی اور حاضرین منتشر ہو گئے۔

(بشکریہ برہان دہلی)

رسائل و مسائل

ضبطِ ولادت

سوال - آج کل ضبطِ ولادت کو خاندانی منصوبہ بندی کے عنوانِ جدید کے تحت مقبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے حق میں معاشی دلائل کے علاوہ بعض لوگوں کی طرف سے مذہبی دلائل بھی فراہم کیے جارہے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جارہا ہے کہ حدیث میں عزل کی اجازت ہے اور برتھ کنٹرول کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اب حکومت کی طرف سے مردوں کو بانجھ بنانے کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جارہی ہیں چنانچہ بعض ایسے ٹیکے ایجاد ہورہے ہیں جن سے مرد کا جوہرِ حیات اس قابل نہیں رہتا کہ وہ افزائشِ نسل کا ذریعہ بن سکے لیکن جنسی لذت برقرار رہتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ طریقہ بھی شرعاً قابلِ اعتراض نہیں اور نہ ہی یہ قتلِ اولاد یا اسقاطِ حمل کے ضمن میں آسکتا ہے۔

براہِ کرم اس بارے میں بتائیں کہ آپ کے نزدیک اسلام اس طرزِ عمل کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔

جواب - ضبطِ ولادت کے موضوع پر میں اب سے کئی سال پہلے ایک رسالہ لکھ چکا ہوں جس میں دینی، معاشی، اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر بحث موجود ہے۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ عزل کے متعلق جو کچھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضورؐ نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا۔ ضبطِ ولادت کی کوئی عام دعوت و

تحریک ہرگز پیش نظر نہ تھی۔ نہ ایسی کسی تحریک کا مخصوص فلسفہ تھا جو عوام میں پھیلایا جا رہا ہو، نہ ایسی تدابیر وسیع پیمانے پر ہر مرد و عورت کو بتائی جا رہی تھیں کہ وہ باہم مباشرت کرنے کے باوجود استقرارِ حمل کو روک سکیں اور نہ حمل کو روکنے والی دوائیں اور آلات ہر کس و ناکس کی دسترس تک پہنچائے جا رہے تھے۔ عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحیت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ ایسی کوئی تحریک اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اس کے خلاف ویسا ہی جہاد کرتے جیسا شرک و بت پرستی کے خلاف آپ نے کیا۔ میں ہر اس شخص کو جو عزل سے متعلق آنحضورؐ کے ارشادات کا غلط استعمال کر کے انہیں موجودہ تحریک کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے خدا سے ڈراتا ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اس جسارت سے باز رہے۔ مغرب کی بے خدا تہذیب و فکر کی پیروی اگر کسی کو کرنی ہو تو سیدھی طرح اسے دینِ مغرب سمجھ کر ہی اختیار کرے۔ آخر وہ اسے عین خدا و رسول کی تعلیم قرار دے کر خدا کا مزید غضب مول لینے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

اسلام جس طرح ضبطِ ولادت کی عمومی تحریک کو روا نہیں رکھتا، اسی طرح وہ قصداً بانجھ بننے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ یہ کہنا کہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو بانجھ کر لینا کوئی ناجائز کام نہیں ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا غلط ہے کہ آدمی کا خودکشی کر لینا جائز ہے۔ حاصل اس طرح کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے نزدیک آدمی اپنے جسم اور اس کی قوتوں کا خود مالک ہے اور اپنے جسم اور اس کی قوتوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرنا چاہے، کر لینے کا حق رکھتا ہے۔ اسی

غلط خیال کی وجہ سے جاپانی خودکشی کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے بعض جوگی اپنے ہاتھ یا پاؤں یا زبان بیکار کر لیتے ہیں۔ لیکن جو شخص اپنے آپ کو خدا کا مملوک سمجھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ یہ جسم اور اس کی قوتیں خدا کا عطیہ اور اس کی امانت ہیں، اس کے نزدیک اپنے آپ کو بانجھ کر لینا ویسا ہی گناہ ہے جیسا کسی دوسرے انسان کو زبردستی بانجھ کر دینا یا کسی کی بینائی ضائع کر دینا گناہ ہے۔

اجنبی ماحول میں تبلیغِ اسلام

سوال: میں علی گڑھ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہوں اور آج کل نائیجیریا میں بحیثیت سائنس ٹیچر کام کر رہا ہوں۔ جب میں ہندوستان سے یہاں آ رہا تھا اس وقت خیال تھا کہ میں ایک مسلم اکثریت کے علاقہ میں جا رہا ہوں اس لیے شرعی احکام کی پابندی میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ لیکن یہاں آ کر دیکھا تو معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ جس علاقے میں میرا قیام ہے یہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں عیسائی مشنریز خوب کام کر رہے ہیں۔ بہت سے اسکول اور ہسپتال ان کے ذریعے سے چل رہے ہیں۔ مسلمان یہاں پانچ فی صدی سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی نہیں بول سکتے حالانکہ ہر ایک عیسائی تھوڑی بہت انگریزی بول لیتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی بہت مانگ ہے۔ یہاں پر بہت سے غیر ملکی ٹیچر اور سوداگر کام کر رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر عیسائی اور ہندو ہیں۔ میں اپنی طرز کا اکیلا ہوں۔ میرے شہر میں صرف تین بہت چھوٹی مسجدیں ہیں۔ وہ بھی بہت ہی شکستہ حالت میں ہیں۔ اس کے علاوہ دُور دُور کہیں اذان کی آواز بھی نہیں آتی۔ یہ ملک اکتوبر میں آزاد ہونے والا ہے۔ مجموعی حیثیت سے پورے ملک میں مسلم اکثریت ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلم کلچر کے مقابلہ میں مغربی اور عیسائی کلچر یہاں بہت

نمایاں ہے۔ شراب کا استعمال شاید مغربی ممالک سے بھی زیادہ ہے لیکن ان سب کے باوجود دو باتیں یہاں خاص طور پر دیکھنے میں آئیں۔ ایک انسانی رواداری۔ اس معاملہ میں یہ لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ غیر ملکی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جو مسلمان یہاں ہیں ان کے اوپر مغربی طرزِ فکر کا اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ ہمارے ہاں ہے ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ لوگ اب تک مغربی تعلیم کا بائیکاٹ کرتے رہے ہیں

ان حالات میں آپ مشورہ دیجیے کہ کس طرح اسلام کی صحیح نمائندگی کی جائے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزی میں کونسا لٹریچر دیا جائے۔ پڑھا لکھا طبقہ انگریزی لٹریچر سمجھ سکتا ہے۔ "پردہ" کی طرح اگر کوئی کتاب شراب نوشی پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیے۔

دوسرے یہ بھی آپ سے مشورہ چاہتا ہوں کہ ایسے حالات میں کس طرح انسان صحیح راہ پر قائم رہے جبکہ ماحول اور سوسائٹی دوسرے رنگ میں رنگے ہوں۔

نیز حسبِ ذیل چیزوں پر اگر روشنی ڈالیں تو آپ کا مشکور رہوں گا۔

۱۔ یہاں پر دعوتوں اور پارٹیوں میں شراب کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ان دعوتوں میں شرکت کرنا چاہیے یا نہیں؟ اب تک میرا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ ایسی جگہوں پر ضرور شرکت کرتا ہوں اور شراب اور دوسری اس قسم کی چیزوں سے انکار کر دیتا ہوں تاکہ کم از کم ان کو یہ احساس تو ہو جائے کہ بعض لوگوں کو ہماری یہ مرغوب غذا ناپسند ہے۔

۲۔ ان کے برتنوں میں کھانا اور پینا درست ہے یا نہیں۔

۳۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں الکوہل کی تھوڑی بہت آمیزش ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے ان کا استعمال جائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟

۴۔ اگر کوئی دعوت کچھ لوگوں کو یہاں دی جائے تو اس میں شراب دی جاسکتی ہے

یا نہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ بغیر شراب کے دعوت ہی نہیں سمجھتے۔ اور اگر اس کا استعمال نہ کیا جائے تو اس کا کیا بدل دیا جائے ؟

جواب :۔ خوشی ہوئی کہ آپ کو ملک سے باہر ایک ایسی جگہ کام کرنے کا موقع ملا ہے جہاں آپ اسلام کی بہت کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی جگہ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ پسماندہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کے سامنے حقیقی اسلام کی نمائندگی کے لیے مامور ہیں، اور اپنے قول یا عمل سے اگر آپ نے ذرا بھی غلط نمائندگی کی تو بہت سے بندگانِ خدا کی گمراہی کا وبال آپ کے اوپر ہوگا۔ اس احساس کے ساتھ اگر آپ وہاں رہیں گے اور اپنی حدِ استطاعت تک اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ایک مسلمان کی زندگی کا نمونہ بننے کی کوشش کرتے رہیں گے تو امید ہے کہ یہ آپ کی اپنی ترقی کے لیے بھی مفید ہوگا اور کیا عجب کہ یہی چیز آپ کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی بن جائے جس کا اجر آپ کو خدا کے ہاں نصیب ہو۔

وہاں کے جو حالات مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوتے ہیں ان پر غور کرنے کے بعد میرے نزدیک کام کی جو صورتیں مناسب ہیں وہ عرض کیے دیتا ہوں۔

مقامی زبان سیکھنے اور بولنے کی مشق کریں اور صرف انگریزی پر اکتفا نہ کریں۔ غیر ممالک میں جب باہر کا کوئی شخص مقامی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور اس کی بات بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔

مقامی مسلمانوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھائیے۔ ان کو صحیح دین سمجھانے اور اسلامی طور طریقے سکھانے کی کوشش کیجیے۔ ان میں سے جن کے بچے آپ کے مدرسے میں پڑھتے ہوں ان پر خاص توجہ کیجیے تاکہ وہ آپ کو اپنا ہمدرد سمجھیں۔ دوسرے مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو بھی اگر آپ ان کی تعلیم میں کچھ مدد دے سکتے ہوں تو ضرور دیجیے۔ جو لوگ آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتے ہوں انہیں پڑھائیے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ پیدا کیجیے اور پھر ان کے اندر دین کا صحیح علم و عمل پھیلانے اور ان کے حالات درست کرنے کی سبیل

نکال لیے۔ ان میں اگر کچھ با اثر آدمیوں سے تعلقات ہو جائیں تو انہیں مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے طریقے بتائیے اور اخلاص و حکمت کے ساتھ کام کرنے پر اُبھاریے۔ بے غرضی، محبت، تواضع اور حقیقی خیر خواہی کے ساتھ جب آپ ان کی بھلائی کے لیے کوشاں ہوں گے تو دیر یا سویر، انشاء اللہ ایک دن آپ ان کے دل اپنی مٹھی میں لے لیں گے اور وہ آپ کے کہے پر چلنے لگیں گے۔

جس مدرسے میں آپ کام کرتے ہیں وہاں اپنے طرزِ عمل سے اپنی اہلیت، فرض شناسی اور بلند اخلاقی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کیجیے، یہاں تک کہ طلبہ اور اساتذہ اور منتظمین سب پر آپ کا اخلاقی اثر قائم ہو جائے۔ پھر وہ راستے تلاش کیجیے جن سے آپ غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ میں اپنے خیالات پھیلا سکیں۔ اس معاملہ میں غایت درجہ تدبر و دانائی کی ضرورت ہے۔ جو موقع بھی اسلام کی نمائندگی کا ملے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیجیے لیکن ایک قدم بھی غلط نہ اٹھائیے ورنہ نتائج اُلٹے برآمد ہوں گے۔ طبیب کی دانائی اسی میں ہے کہ وہ مریض کو ٹھیک دوا کی خوراک بروقت دے، نہ کم خوراک دے اور نہ زیادہ دے بیٹھے۔

عام لوگ جن سے آپ کا میل جول ہو ان سے اپنی گفتگوؤں میں مناسب طریقے پر اسلام کا تعارف کرائیے۔ مغربی تہذیب کی کمزوریاں ان پر واضح کیجیے۔ عیسائیت کی ناکامی اس حد تک انہیں سمجھائیے جس کے سننے کا ان میں تحمل ہو۔ پھر جن لوگوں میں اسلامی لٹریچر دیکھنے کی خواہش آپ پائیں ان کو موزوں لٹریچر پڑھنے کے لیے دیجیے۔ مانگ پیدا کیے بغیر ہر ایک کو لٹریچر دینا شروع نہ کر دیجیے۔ انگریزی لٹریچر کی ایک فہرست آپ کو یہاں سے بھجوا دی جائے گی اسے منگوا کر اپنے پاس رکھ لیں۔

غیر مسلموں میں سے جن کے اندر آپ خاص صلاحیت، سلامتِ طبع اور حق پسندی محسوس کریں ان سے ذاتی تعلقات بھی بڑھائیے اور ان پر خصوصیت کے ساتھ کام بھی کیجیے تاکہ اللہ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ لیکن اپنے ہاتھ پر کسی کو مشرف با سلام کرنے سے پرہیز کیجیے۔ جو شخص بھی مسلمان ہونا چاہے اسے مقامی مسلمانوں کے پاس بھیجیے۔

شراب نوشی کے خلاف انگریزی میں بہت سا لٹریچر موجود ہے۔ آپ (CHURCH) (OF ENGLAND TEMPERANCE SOCIETY) سے لندن کے پتہ پر اور (ANTI-) (SALOON LEAGUE OF AMERICA) سے واشنگٹن کے پتے پر مراسلت کر کے اس موضوع کے متعلق لٹریچر کی فہرستیں منگوائیں اور مناسب کتابوں کا انتخاب کر کے حاصل کر لیں۔

اب مختصر طور پر میں آپ کے سوالات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

(۱) دوسروں کی طرف سے اگر آپ کو دعوت دی جائے تو اس میں ضرور شرکت کریں کیونکہ اس کے بغیر آپ ان کی اصلاح کے لیے ان سے کھل مل نہ سکیں گے۔ اس نیت کے ساتھ اگر آپ ایسی محفلوں میں شریک ہوں جہاں لوگ شراب پیتے ہوں تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر علانیہ نہ صرف یہ کہ شراب پینے سے پرہیز کریں بلکہ کھلم کھلا اس پرہیز کے معقول وجوہ ہر پوچھنے والے کو ایسے طریقے سے سمجھائیں کہ اسے ناگوار خاطر نہ ہو۔ شرابیوں کی محفل میں اُن لوگوں کی شرکت تو بلا شبہ مضر ہے جو شراب نہ پینے پر شرماتے ہوں، لیکن اُن لوگوں کی شرکت بہت مفید ہے جو دھڑلے کے ساتھ شراب نوشی سے انکار کریں اور دلیل کی طاقت سے شراب پینے کی برائی وہیں اسی محفل میں ان لوگوں کو سمجھانے پر آمادہ ہو جائیں جو ان سے شراب نہ پینے کے وجوہ دریافت کریں۔ یہ تو بہترین تبلیغ ہے جس پر میں خدا سے اجر کی توقع رکھتا ہوں۔

(۲) ان کے صاف ڈھلے ہوئے برتنوں میں آپ کھانا کھا سکتے ہیں اگر آپ کو اطمینان ہو کہ وہ کسی حرام چیز سے ملوث نہیں ہیں۔ اطمینان نہ ہونے کی صورت میں بہتر یہ ہے کہ آپ دعوت وصول ہوتے ہی اپنی اولین فرصت میں داعی کو اپنے اصول اور مسلک سے آگاہ فرما دیں اور ان کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے ساتھ دعوت میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۳) جن چیزوں میں الکوہل کی آمیزش ہو ان کا استعمال اس وقت تک نہ کرنا چاہیے

جب تک کوئی طبیب آپ کی جان بچانے کے لیے یا آپ کی صحت کو غیر معمولی نقصان سے بچانے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر نہ بتائے۔

(۴) آپ خود جن لوگوں کو مدعو کریں ان کو ہرگز شراب نہ پلائیں۔ دعوت دینے سے پہلے آپ کو انہیں آگاہ کر دینا چاہیے کہ آپ دعوت میں اپنے اصول کے خلاف کسی کو شراب نہیں پیش کر سکتے۔ اس شرط پر جو لوگ آپ کی دعوت قبول کریں صرف انہی کو مدعو کیجیے۔ شراب کا بدل پیش کرنا ہو تو پاکستان یا ہندوستان سے شربت روح افزا یا ایسا ہی کوئی اور خوش رنگ و معطر مشروب منگوا لیجیے۔ امید ہے کہ وہ ان لوگوں کو بہت پسند آئے گا۔

ضرورت ہے

ایک انگریزی پڑھے لکھے دینی گھرانے کے گیارہ سالہ بچے کے لیے ایک ایسے شائستہ با اخلاق اور ہمہ وقت اتالیق کی ضرورت ہے جو معیاری طور پر عربی، فارسی، قرآن، حدیث، سیرت دبہ حیثیت مضمون تاریخ اسلام، اخلاقیات، جغرافیہ و سیاسیات اور اردو پڑھا سکیں اور خالص دینی بنیادوں پر بچے کی ہمہ وقت تعمیر و تربیت کر سکیں۔ اور فنون سپہ گری کی الگ سے تحصیل کے وقت بچے کی اخلاقی نگرانی فرما سکیں۔

اتالیق کے پاس ذیل کی صفات و اسناد کا ہونا ضروری و لازمی ہے۔ اسلام کے لیے سچا اور مقصدی جذبہ و فکر رکھتے ہوں۔

اسلام کے تحریکی و تعمیری تصور تعلیم سے واقف ہوں اور اس سے گہرا لگاؤ رکھتے ہوں۔ مذکورہ مضامین نہ صرف معیاری طور پر پڑھا سکیں بلکہ ان کا مقصدی و تحقیقی ذوق پیدا کر سکیں۔ بچے میں تنقیدی و علمی رنگ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ تعلیمی نفسیات سے واقف ہوں۔ کسی اونچے درجے کے مستند اہلِ علم کی تصدیق سند مانی جائے گی اور اپنے ہاں کے مقامی کم از کم چار اسلام پسند حضرات کی تصدیق بھی ضروری ہوگی۔ عمر کی کوئی قید نہیں۔ معاوضہ ۱۲۵ روپے ماہوار۔ قیام و طعام کا انتظام مفت ہوگا۔ اس پتہ پر رجوع کیجیے: محترمہ اُمّ احمد صاحبہ ایم اے معرفت زیڈ۔ ایچ۔ پیرزادہ ۸۰۔ الف ماڈل ٹاؤن لاہور

مطبوعات

قادیانیت مطالعہ و جائزہ | از: مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ضخامت ۳۶۰ صفحات (بڑا سائز) مجلد، رنگین گردپوش، چکنا سفید کاغذ، روشن کتابت۔ دیدہ زیب طباعت، قیمت چار روپے۔ ناشر: مکتبہ دینیات ۴۳۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مولانا ابوالحسن علی ندوی دنیائے اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی گہری مذہبیت، اُن کے اخلاص، ان کے تبحرِ علمی، ان کے عمل کی مداومت اور عربی اور اُردو کے دلآویز اسلوبِ نگارش نے ہر اس شخص سے خراجِ عقیدت حاصل کیا ہے جو دین کا کچھ بھی درد رکھتا ہو۔

زیرِ تبصرہ کتاب اُن کی تازہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے قادیانی مسئلہ کا بڑے سنجیدہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ گذشتہ سال یہ کتاب عربی میں "القادیانی والقادیانیۃ" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب اسے فاضل مصنّف نے یہاں کی ضروریات کے پیشِ نظر اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔ بعض مفید اور قابلِ قدر اضافوں نے اس ترجمہ میں ایک مستقل تصنیف کی شان پیدا کر دی ہے۔

تبصرہ نگار کے نزدیک قادیانی مذہب کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک ذہنی شبخون تھا جو نیند کے ماتے مسلمانوں پر انگریز کی شہ سے مارا گیا۔ ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ ایک ایسا دردناک حزنیہ، ایک ایسی المناک ٹریجڈی اور ایک ایسی وحشتناک تحریک ہے جس کے اثرات کو دیکھ کر مسلمان تو کیا غیر مسلموں کی بھی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔

دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے انہوں نے مخلوقِ خدا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کیا، دنیا کی تنگی سے نجات دیکر وسعت و کشائش

کی راہیں دکھائیں، ظلم و جور سے بچا کر انہیں عدل و انصاف کی فضا میں آباد کیا اور اس طرح انسانیت کی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کے دعویٰ کے ساتھ خدا کے بندوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ انگریز کی بندگی اختیار کریں اور ظلم و جور کے اس طوق کو ہنسی خوشی پہن لیں۔ یہ ہے اس تحریک کا منتہائے مقصود۔

اس کے علاوہ خدا کے پاکباز بندوں نے اپنے افکار و نظریات سے ہمیشہ اس بات کو ثابت کیا کہ علم کوئی گورکھ دھندا نہیں کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دیئے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو راہ دکھا سکتا ہے لیکن آپ مرزا صاحب کی ساری تحریریں اور تقریریں پڑھ جائیے، آپ کو معلوم ہو گا کہ زندگی ابن الوقتی اور بے اصولے پن کا دوسرا نام ہے اور علم بھول بھلیاں ہیں جن میں ایک انسان کو بڑی آسانی کے ساتھ پھانسا جا سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس علم کے خلاف جو انگریز کے آنے کے بعد نئے انداز کی جہالت اور اُس تہذیب کے خلاف جو نئی قسم کی وحشت اور اُس ترقی کے خلاف جس کی روشنی میں جہنم کی آنچوں کا اثر تھا کوئی منظم کوشش نہ کی بلکہ لوگوں کے دماغوں کو اپنے گمراہ کُن خیالات سے اس قدر اُلجھا دیا کہ اُن کے اندر حق و باطل کی کوئی تمیز بھی باقی نہ رہی اور اُن میں سے بہت سے لوگوں نے تنگ آکر دین کو ہی خیرباد کہہ دیا۔

مولانا ابوالحسن نے بڑی دیدہ وری سے مرزا صاحب کے سیرت و کردار، اُن کے مقاصد اور اُن کے طرزِ استدلال کا جائزہ لیا ہے۔

سب سے پہلے مرحلے پر ہی دیکھیے کہ وہ کس طنطنے کے ساتھ براہینِ احمدیہ کی ۵۰ جلدیں لکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب کام مکمل نہیں ہوا تو یہ مضحکہ خیز دلیل پیش کر کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

"پہلے پچاس حصے لکھنے کا ارادہ تھا مگر پچاس سے پانچ پر اکتفا کیا گیا اور

چونکہ پچاس اور پانچ کے عدد میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے اس لیے پانچ حصوں میں وہ وعدہ پورا ہو گیا (دیباچہ براہین احمدیہ ج ۵ ص۷)

مرزا صاحب کی تاویلات کی فہرست بڑی لمبی ہے لیکن یہاں ہم صرف اُس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

مرزا صاحب کے مخالفین نے ان پر اعتراض کیا کہ نزول مسیح کی جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں اور اُن پر اپنی دعوت و دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں ان میں یہ بھی تو آتا ہے کہ جس وقت حضرت مسیح نزول فرمائیں گے اُن پر زرد چادریں ہوں گی۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب فرماتے ہیں:

"میں ایک دائم المریض آدمی ہوں اور وہ دو زرد چادریں جن کے بارے میں حدیثوں میں ذکر ہے کہ ان دو چادروں میں مسیح نازل ہو گا وہ دو زرد چادریں میرے شامل حال ہیں جن کی تعبیر علم تعبیر الرؤیا کی رُو سے دو بیماریاں ہیں سو ایک چادر میرے اوپر کے حصے میں ہے کہ ہمیشہ سردرد اور دورانِ سر اور کمیٔ خواب اور تشنج دل کی بیماری دورہ کے ساتھ آتی ہے اور دوسری چادر جو میرے نیچے کے حصہ بدن میں ہے وہ بیماری ذیابیطس ہے کہ ایک مدت سے دامنگیر ہے اور بسا اوقات سو سو دفعہ رات کو یا دن کو پیشاب آتا ہے اور اس قدر کثرتِ پیشاب سے جس قدر عوارض ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وہ سب میرے شاملِ حال ہیں۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

ذرا انگریز پرستی ملاحظہ ہو:

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام

ممالک عرب، مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ (تریاق القلوب ص۱۵)

مرزا صاحب نے محمدی بیگم کے نکاح کے لیے جس قسم کے پاپڑ بیلے اور مختلف موقعوں پر جو شرمناک کھیل کھیلا وہ ایک عام انسان کی سطح سے بھی بہت پست چیز ہے۔ انہوں نے اس نکاح کو اپنے سچا اور جھوٹا ہونے کا خود ہی معیار بنایا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے کہ جس چیز کو انہوں نے حق و باطل کا مدار ٹھہرایا تھا اُسی کے مطابق اُس ذات نے انہیں جھوٹا ثابت کیا۔ مرزا صاحب کے نکاح کا خواب خواب ہی رہا، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

کتاب کے آخر میں فاضل مصنف نے یہ فکر انگیز بحث اٹھائی ہے کہ کیا قادیانیت ایک فرقہ ہے یا ایک مستقل مذہب۔ اُن کا تجزیہ بالکل صحیح اور درست ہے اور ہمارے نزدیک یہی اصل میں کتاب کی جان ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"وہ (قادیانیت) قلب و دماغ اور فکر و اعتقاد کا ایک نیا مرکز قائم کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو ایک فرقہ اور فقہی یا کلامی دبستان یا مکتبِ خیال سے زیادہ ایک مستقل مذہب اور نظامِ زندگی کی شکل عطا کرتی ہے .... جو افراد خلوص اور جوش کے ساتھ اس تحریک و دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں، ان کے فکر و اعتقاد کا مرکز بدل جاتا ہے .... انفرادیت اور تقابل کا یہ رجحان قادیانیت کے اندر شروع ہی سے کام کر رہا ہے اور وہ اب بلوغ و پختگی کے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ قادیانی اصحاب بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اسلامی شعائر و مقدسات کے ساتھ قادیانی شعائر اور مقدسات کا مقابلہ کرتے ہیں اور اُن کا ہم پلہ اور مساوی قرار دیتے ہیں صحابہ کرامؓ کو اسلام کے دینی نظام میں جو مرکز و مقام حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن قادیانی

اصحاب مرزا صاحب کے رفقا اور ہم نشینوں کو صحابۂ رسول ہی کا درجہ دیتے ہیں۔"

ص ۱۷۰-۱۷۱

مولانا نے فصل سوم میں قادیانیت کی لاہوری شاخ کا بھی جائزہ لیا ہے اور محمد علی لاہوری کے تفسیری کارناموں کی قلعی کھولی ہے۔ انہوں نے نہایت واضح مثالوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تفسیر تفسیر نہیں بلکہ قرآن مجید کی تحریف معنوی اور تلعب بالقرآن ہے جس سے الحاد وزندقہ کے دروازے کھلتے ہیں۔

کتاب کے بالکل آخر میں انہوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ امت مسلمہ دورِ جدید میں ایک ایسے رہنما کی محتاج ہے جو عالم اسلامی میں روح جہاد اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کردے۔ جو اپنی ایمانی قوت اور دماغی صلاحیت سے دین میں ادنیٰ تحریف و ترمیم قبول کیے بغیر اسلام کے ابدی پیغام اور عصر حاضر کی بے چین روح کے درمیان مصالحت و رفاقت پیدا کر سکے اور شوخ و پرجوش مغرب سے آنکھیں ملا سکے۔

دوسری طرف وہ عالم اسلام میں پھیلی ہوئی مختلف دینی و اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کو دُور کرنے کی بھی جد و جہد کرے۔

یہ ہیں اس وقت امتِ مسلمہ کے تقاضے۔ فاضل مصنف کے اس معیار کے مطابق جو بالکل درست ہے، جب ہم مرزا صاحب کی "خدمتِ دینی و ملی" کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ انگریز کے اس "خود کاشتہ پودے" نے فرنگی کی خدمت کرنے اور مسلمانوں سے لڑنے جھگڑنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔

انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تو انہوں نے لوگوں کے فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی اور اخلاق میں پاکیزگی پیدا کی۔ پھر انہوں نے اجتماعی حیثیت سے بھی ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالی جس کی معاشرت میں حسنِ سلوک، تہذیب میں نفسیلت، تمدن میں توازن، معیشت میں عدل و مواساۃ ہو۔ لیکن جب مرزا صاحب تشریف لائے تو انہوں نے

لوگوں کے ذہن میں الجھاؤ، طبیعت میں جوش اور اشتعال، سیرت میں بے اصولاپن اور اخلاق میں ابن الوقتی پیدا کرنے کے سامان مہیا کیے اور اجتماعی حیثیت سے ایک ایسا نظام قائم کر گئے جو ہر قسم کے جور و جفا کو نہ صرف برداشت کرتا ہے بلکہ اس کی تائید و حمایت بھی کرتا ہے۔ اور اس نظام کی سربراہی کا منصب جس شخص کو حاصل ہو جائے اُسے ایک ایسی حیثیت مل جاتی ہے جس کے سامنے اختلاف دم بخود ہو، جس کے روبرو تنقید مہر بلب رہے اور آزادی جس کے حضور میں سینے پر ہاتھ باندھ کر وقت گزار دے۔

دین کی باتیں | تالیف مولانا محمد عبدالحی صاحبؒ۔ شائع کردہ مکتبہ الحسنات۔ رامپور (بھارت)، قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے (۱۲/۳)، صفحات ۲۵۳۔

کتاب کے تعارف میں فاضل مصنف فرماتے ہیں "عرصے سے اس ضرورت کا احساس کیا جا رہا تھا کہ جن لوگوں کے لیے مشکل عبارتوں اور علمی بحثوں کو سمجھنا دشوار ہے ان کے لیے کوئی ایسی کتاب تیار کی جائے جو آسان زبان اور سادہ انداز میں دین کا اجمالی تعارف کرا سکے اور جس کے پڑھنے کے بعد ایک عام آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور اعمال کیا ہیں، زندگی کے مختلف گوشوں میں اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے اور ایمان اور اسلام کے وہ تقاضے کیا ہیں جنہیں پورا کرنا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔"

ہم نے اس کتاب کو اوّل تا آخر پڑھا ہے اور ہم مولانا محمد عبدالحی صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس مقصد میں بہت کامیاب ہیں۔ کتاب کی زبان نہایت سادہ اور انداز بیان بڑا دلکش ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد ایک شخص دین کے تقاضوں سے بآسانی واقف ہو سکتا ہے۔ پاکستان میں یہ کتاب اسلامی پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے مل سکتی ہے۔

دین کی خدمت یعنی مسلمان مردوں کی ذمہ داری | تالیف مولانا ابوسلیم محمد عبدالحی صاحب۔ شائع کردہ: مکتبہ الحسنات رام پور (بھارت)، قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اُسے ان سے کس طرح عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ کتاب کے آخر میں اس راہ کی مشکلات کا بھی قدرے تفصیل سے ذکر موجود ہے اور پھر ان مشکلات کے حل کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

دین کی حفاظت مسلم خواتین کے کرنے کا کام | تالیف ابو سلیم محمد عبدالحی صاحب۔ شائع کردہ: مکتبہ الحسنات رام پور (بھارت)۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

اس کتابچہ میں فاضل مصنف نے خواتین کو اُن کے فرائض سے آگاہ کیا ہے اور حقیقت یہ ہے ان کی ذمہ داریاں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ نازک اور اہم ہوتی ہیں۔ اسلام کو سربلند کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کامیاب نہیں ہو سکتی اگر خواتین اُس میں پوری طرح شامل نہ ہوں۔

اخلاقی کہانیاں حصہ اوّل، دوم، سوم | مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم۔ اے، ایل، ٹی۔ ناشر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

اخلاقی کہانیوں کا یہ مفید سیٹ بچوں کے اندر اسلامی سیرت و کردار پیدا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور اس معاملے میں یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ ٹائیٹل دیدہ زیب اور دلکش ہیں اور بچوں کے ذوق کے عین مطابق۔

(بقیہ اشارات)

کر سکیں۔ وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں، جو ہمیں گردوپیش کے ان حقائق سے غافل کر دیں جن کی معرفت ہی پر زندگی کا دارومدار ہے، وہ دراصل بربادی کا اور موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونک دے نہ کہ وہ جو ہم پر حالتِ سکر طاری کر دے۔"

اس میں شک نہیں کہ آرٹ انسانی فطرت کی ایک پیدائشی امنگ ہے جسے خود خالقِ فطرت نے اپنے ہر کام میں ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ آرٹ لازماً اُسی بے حیائی کا نام ہے جو جاہلیت کی پیداوار ہے۔ آرٹ کے مظاہر تہذیب و تمدن کے اختلاف کی وجہ سے فطری طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور دنیا کی ہر تہذیب اپنے افکار و نظریات کے مطابق ہی انہیں جنم دیتی اور پروان چڑھاتی ہے۔ مسلمانوں کے اندر فنِ قرأت کا ارتقاء انسان کی اسی امنگ کا جائز اظہار ہے۔ حضور سرورِ کائنات اور صحابہ کو بھی سماع سے لگاؤ اور دلچسپی تھی لیکن وہ اسے کلامِ پاک کی تلاوت سے پورا کرتے۔ حضور کا یہ بھی دستور تھا کہ وہ بسا اوقات جب اپنے اصحابؓ کے ساتھ بیٹھتے تو ان سے تلاوتِ قرآن کی فرمائش کرتے۔ چنانچہ صحیحین میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا: مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا "آپ کو سناؤں، حالانکہ قرآن آپ ہی پر اُترا ہے"۔ اس پر آپ نے فرمایا:

انی احب ان اسمعہ من غیری — میں چاہتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے اسے سنوں۔

حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں "میں نے سورۂ نساء شروع کر دی۔ جب میں اس آیت پر پہنچا

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ — (اے نبیؐ) اُس (قیامت کے) دن کیا حال ہوگا

وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ جب ہم ہر ایک امت میں سے ایک ایک گواہ
(۴ : ۴۱) طلب کریں گے اور ہم تمہیں ان لوگوں پر گواہی
دینے کے لیے طلب کریں گے۔

اس پر آپ نے فرمایا: حسبك ، بس کرو۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو چشم مبارک سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔[ا]

شمع رسالت کے پروانے قرآن مجید سننے کے لیے اکثر اوقات اکٹھے ہوتے اور مجلس میں سے ایک شخص کو کتاب اللہ کی تلاوت کرنے کے لیے کہا جاتا اور باقی سب اسے نہایت جذب وشوق کے ساتھ سنتے رہتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابو موسیٰ اشعری سے اکثر فرمایا کرتے تھے: ہمیں پروردگار یاد دلاؤ۔ چنانچہ وہ تلاوت شروع کر دیتے اور تمام حاضرین خاموشی اور محویت کے ساتھ متوجہ ہوتے۔

حضرت ابو عثمان ہندی کا بیان ہے کہ میں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا ہے لیکن میں نے چنگ و بربط کی آواز کو بھی ابو موسیٰ اشعری کی خوش الحانی سے بہتر نہیں پایا، وہ ہم کو نماز فجر پڑھاتے تھے تو جی چاہتا تھا کہ پوری سورۃ بقرہ ہی تلاوت فرما دیں۔

یہ ہے وہ سماع جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے جس کے ذریعہ قلب کے اندر پاکیزگی اور روح کے اندر لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی سماع کی طرف سرور کائنات ﷺ اور ان کے رفقاء کارؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور امت کے دوسرے ائمہؒ اور صلحاءؒ نے لوگوں کو رغبت دلائی ہے۔

رقص و سرود کے ساتھ ساتھ جس دوسری لعنت کو اس ملک میں عام کیا جا رہا ہے وہ مصوری ہے۔ اس کے بارے میں اسلام نے جس شدت کے ساتھ ناپسندیدگی کا اظہار

[ا] بحوالہ السماع والرقص امام ابن تیمیہؒ

کیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ تصویریں بناتے ہیں ان پر قیامت میں عذاب ہوگا اور اُن سے کہا جاتے گا کہ ان تصویروں میں جان ڈالو (بخاری ومسلم)

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ قیامت میں اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ سخت ترین عذاب کے لائق مصوّر ہوں گے۔

حضور سرورِ دوعالمؐ کو تصویر کشی سے جس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے تشریف لاتے اور میں نے دروازہ پر ایک پردہ ڈال رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ جب آپ کی نظر اس پردے پر پڑی تو آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: اے عائشہ قیامت میں سب سے زیادہ عذاب ان کو ہوگا جو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی نقل اتارنا چاہتے ہیں۔ پس ہم نے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ایک یا دو تکیے بنا لیے۔"

(بخاری ومسلم)

مصوری اور گانے بجانے جیسی سرگرمیوں کا جب کسی سوسائٹی میں عام چلن ہو جاتا ہے تو اس سے نہ صرف انسانوں کی عملی قوتیں افسردہ اور مضمحل ہو جاتی ہیں بلکہ اُس قوم میں بے حیائی اور فحاشی کا طوفان بھی اُٹھتا ہے اور اس سے پورے معاشرے کے اندر ایک زبردست بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے ہمارے اس ملک میں جب سے یہ سرگرمیاں تیز ہوئی ہیں اس وقت سے لوگوں کے اندر کس قسم کے غیر اسلامی رجحانات پرورش پاتے چلے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں ہفت روزہ

" شہاب " لاہور میں ایک خط شائع ہوا ہے جس سے ان رجحانات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
مکتوب نگار لکھتے ہیں:

"ہمارے کالج میں اس دفعہ میوزیکل کنسرٹ بھی دھوم دھام سے ہوا۔ ہاسٹل میں سالانہ فنکشن پر اسلام کے ہر رکن کا دل کھول کر مذاق اڑایا گیا۔ ہمارے ایمان کی کمزوری کا اندازہ لگائیے کہ قاسم ہال کے فنکشن میں ایک لڑکے کے خلاف قوالی کی شکل میں کچھ مذاقیہ فقرے کہنے سے کالج میں دو دن تک خوب لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چاقو چلے۔ پھر دوسرے فنکشن میں اگر پروفیسروں کے خلاف کچھ مذاق کیا گیا تو انہوں نے فنکشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ لیکن جب ایک فنکشن میں تمام حاجیوں کو اسمگلر، مولویوں کو کفن چور، منکر نکیر کو راشی، قیامت کے حساب کتاب کو ڈھونگ اور اللہ کی ذات کو سگریٹ پلانے والا (رزاق) بتایا گیا تو کسی دل میں خیال تک نہیں گزرا۔ ایک زبان نہیں جو اس کے خلاف کھلی ہو اور ایک دماغ نہیں جس نے اس کے خلاف سوچا ہو۔"

(شہاب لاہور۔ ۱۳ مارچ ۱۹۶۰ء)

یہ ہے ان ثقافتی سرگرمیوں کی ایک جھلک جن کی آغوش میں قوم کے نوجوانوں کو پالا جا رہا ہے۔ اور بعض اوقات یہ سرگرمیاں اتنی شرمناک صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ خود ان کے پرستار اور حامی چیخ اٹھتے ہیں۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۰ء کے پاکستان ٹائمز میں ایک خط شائع ہوا ہے جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"براہِ کرم مجھے کالج کے ارباب بست و کشاد کی توجہ ایک ایسے واقعہ کی طرف مبذول کرانے کی اجازت دی جائے جو انتہائی افسوسناک ہے۔ موسیقی کے بین الجامعی مقابلہ کے موقع پر ایک پیشہ ور رقاصہ کو رقص کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس رقاصہ نے رقص کا مظاہرہ کرنے سے کہیں زیادہ اپنے اعضاء کی نمائش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو خواتین اس میں شریک تھیں وہ بطورِ احتجاج ہال سے نکل گئیں۔"

آخر غور کیجیے کہ جس قوم کے نوجوانوں میں اس قسم کے رجحانات نشوونما پا رہے ہیں وہ ہمیں ایک سچے مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کے لیے کچھ بھی مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے

ان غیر اسلامی اور اخلاق سوز سرگرمیوں کا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ ہم کوئی نیک سے نیک اور پاک سے پاک کام بھی ان کے بغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے پچھلے دنوں جب اکدیر[1] میں زلزلہ آیا تو ہمارے دینی بھائیوں کی مصیبت دیکھ کر ہمارے دل بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ہم نے اُن کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس مدد کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ لاہور میں رقص و سرود کی محفل منعقد کی گئی اور اس میں خوب رنگ رلیاں منائی گئیں۔ کیا یہ واقعہ ہم سب کے لیے باعثِ شرم نہیں کہ ہم اب اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ مصیبت زدہ انسانوں کی امداد بھی ناچ دیکھے اور گانا سنے بغیر نہیں کر سکتے۔

رفاہی کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے اور ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کے لیے بھی اب ہمیں اگر کوئی مؤثر صورت نظر آتی ہے تو یہی کہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو لوگوں کے سامنے بے حجابانہ پیش کریں۔ ۲۷ مارچ ۱۹۶۰ء کو امروز میں یہ خبریں شائع ہوئیں:

"لاہور میں چندہ جمع کرنے کے لیے ایک مہم شروع ہو رہی ہے جس میں ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ لڑکیاں ایک روپے کے عوض مٹھائی کے پیکٹ بیچیں گی۔ یہ مہم گرل گائیڈز شروع کریں گی اور روپیہ تعلیم بالغان اور رفاہی کاموں پر خرچ ہو گا جو گرل گائیڈز ایسوسی ایشن کر رہی ہے۔ نیا طریقہ اس لیے اپنایا گیا ہے کہ گرل گائیڈز کو چندے کے لیے لوگوں سے سوال نہ کرنا پڑے۔"

---

[1] ہمارے ملک کے اخبارات اس مقام کا نام اغادیر لکھ رہے ہیں۔ مراکش کے اخبارات میں اس کا صحیح نام اکدیر آیا ہے۔

"کراچی ۲۶ مارچ - چھوٹی صنعتوں کی مصنوعات کے مرکز میں داخل ہونے والے کو چھ خوش اندام لڑکیاں خوش آمدید کہیں گی۔ آسمانی رنگ کی ساڑھی اور سفید بلاوز میں ملبوس ان سیلز گرلز کو خاص طور پر تربیت دی گئی ہے۔ جب کوئی گاہک آئے گا تو وہ اس سے خوش خلقی اور تپاک سے پیش آئیں گی۔ انہیں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ چیزیں زیادہ بکیں۔ یہ مرکز جس کا آج افتتاح ہوا، بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا ہے اور اس میں نیپکن سے لے کر قیمتی بنارسی ساڑھی اور سونے چاندی کے ظروف تک موجود ہیں۔"

یہ سب کچھ اس قوم میں ہو رہا ہے جس کی عورتوں کو خدا نے یہ حکم دیا ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	اور وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھو اور گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کی طرح اپنے سنگھار دکھاتی نہ پھرو، اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

غیر محرم مردوں کے ساتھ بن سنور کر تپاک سے پیش آنا تو ایک بہت بڑی بات ہے مسلمان عورتوں کو تو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جب کوئی شخص باہر سے آواز دے اور جواب دینا بھی ناگزیر ہو تو وہ اس کے ساتھ ایسے لہجہ میں بات کریں جس سے اس کے دل میں کوئی بیجا توقع پرورش نہ پا سکے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جن ثقافتی سرگرمیوں اور جن اخلاق سوز رجحانات کا تذکرہ کیا ہے، ایک مسلمان کے لیے وہ کوئی معمولی چیزیں نہیں بلکہ انتہائی افسوسناک ہیں۔ وہ شخص جو سوسائٹی کی نفسیات سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ قصر و ایوان کی ہر تحریک عوام میں بڑے دور رس نتائج پیدا کرتی ہے۔ ہم جو کچھ عرض کر رہے ہیں پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقتدار اپنے مزاج کے اعتبار سے

بڑا ہی نازک اور حساس ہوتا ہے اور اس کی جبین پر فوراً شکن آجاتے ہیں۔ لیکن ہمیں اُس رسوائی کا خوف کہیں زیادہ ہے جو قیامت کے دن پیش آنے والی ہے۔ اُس روز ہم گونگے شیطان ہو کر اٹھیں گے، اگر اِس وقت مہر بہ لب رہیں۔ ہم قوم کی بھلائی اسی میں دیکھتے ہیں کہ اُس کے اندر سے اُن سارے غیر اسلامی رجحانات کو مٹا دیا جائے جو صدیوں سے اُس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہیں اور اسے اُس اسلام کی طرف لوٹایا جائے جو کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ اور سیرتِ اہلِ بیتِ رسول سے ملتا ہے اور جس کی حفاظت و پاسبانی امت کے ائمہ اور صلحا نے کی ہے۔ باقی رہے مسلمان بادشاہوں کے غیر اسلامی افعال، تو ہم ان کو کبھی اپنانے پر تیار نہیں ہیں بلکہ انہیں اتنی ہی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جتنی کہ دوسرے فساق و فجار کی فاسقانہ سرگرمیوں کو۔ کسی شخص کا مسندِ اقتدار پر متمکن ہو جانا اُس کے برحق ہونے کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ صحیح اور درست وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے فرما دیا ہے۔

ہماری ان گزارشات کا مقصد نہ تو کسی کو بدنام کرنا ہے اور نہ ہم کسی قسم کی سنسنی پھیلانا چاہتے ہیں۔ یہ تو دل کا درد ہے جو کاغذ پر منتقل ہو گیا ہے، یہ دل کی چوٹیں ہیں جو الفاظ میں ڈھل گئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے عمائدِ حکومت، جو اسلامی نظام کے قیام کے لیے دل میں مخلصانہ تڑپ ظاہر فرماتے ہیں، ہماری ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ ممکن ہے کہ وہ کہیں تلخی بھی محسوس کریں لیکن بقول مولانا حالی دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔ ہم انہیں ان کے جلیل القدر پیشرو حضرت عمرؓ کے دو زریں اقوال سنا کر بات ختم کرتے ہیں۔

ان الناس لا یزالون مستقیمین ما استقامت لهم ائمتهم وهداتهم	لوگ اس وقت تک سیدھی راہ پر قائم رہیں گے جب تک کہ ان کے حکام اور رہنما سیدھے راستہ پر رہیں گے۔
الرعیة مودیة الی الامام و	لوگ امیر کے حقوق اس وقت تک ادا کریں گے

ما ادی الامام الی اللہ - فاذا رتع الامام رتعوا -

(کتاب الخراج)

جب تک امیر اللہ کے حقوق ادا کرے گا جب امیر بے قید ہو جائے گا تو لوگ بھی بے قید ہو جائیں گے -

---

ضروری اعلان

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن کے ایجنٹوں کی خدمت میں درخواست ہے کہ اگر اُن کے پاس ماہ جنوری سنہ ۶۶ء کے پرچے بچے ہوئے ہوں تو دفتر ترجمان القرآن کو بھیج دیں - اُسی کمیشن پر واپس لے لیے جائیں گے جس پر پرچے بھیجے گئے تھے - پرچے بھیجنے سے قبل دفتر کو اطلاع دینا ضروری ہے - اس کے علاوہ ماہ رجب ۸۵ھ کے ترجمان القرآن کے پرچے بھی بچے ہوئے ہوں تو وہ بھی ارسال کر دیں -

(۲) خریدار صاحبان کو اپنا پتہ تبدیل کرانے کے لیے سابقہ پتہ ضرور لکھنا چاہیے - اسی طرح منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر اپنا نمبر خریداری اور پتہ صاف تحریر فرمائیں، ورنہ عدم تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی - نئے خریدار صاحبان بھی اپنا مکمل پتہ خوشخط اور صاف لکھ کر بھیجا کریں - اور ساتھ ہی جس ماہ سے پرچہ جاری کرنا ہو اُس کا نام لکھ دیا کریں -

چراغ الدین منیجر ترجمان القرآن

خالی صفحه

مطبوعات اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

تصنیفات سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱- اسلام اور جدید معاشی نظریات مجلد معہ گرد پوش		۲/۴
۲- پردہ	,,	۳/-
۳- حقوق الزوجین	,,	۲/-
۴- خطبات	,,	۳/۴
۵- رسالہ دینیات	,,	۲/۸
۶- سلاجقہ	,,	۳/۸
۷- اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر		۱/-
۸- اسلامی دستور کی تدوین		۱/-
۹- سلامتی کا راستہ	,,	-/۶/۹
۱۰- اسلام اور جاہلیت	,,	-/۱۰/-
۱۱- اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر		-/۱۰/-
۱۲- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل		-/۱۰/-
۱۳- توحید و رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت		-/۱۲/۹
۱- ٹوورڈس انڈرسٹینڈنگ اسلام بالکل نیا ترجمہ رسالہ دینیات از پروفیسر خورشید احمد ایم اے - ایل ایل بی		۲/۸/-

۱۵- اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی		زیر طبع
۱۶- تنقیحات		,,

افضل حسین ایم - اے- ایل - ٹی :

۱۷- اخلاقی کہانیاں حصہ اول		-/۶/۹
۱۸- اخلاقی کہانیاں حصہ دوم		-/۶/۹
۱۹- ,,	سوم	-/۱۰/-
۲۰- ,,	چہارم	-/۱۰/-

محمد عبدالحی اے

۲۱- داعی اسلام کی حیات طیبہ		۲/۸/-
۲۲- نبیوں کے حالات حصہ اول		-/۹/۹
۲۳- ,,	دوم	-/۱۰/-
۲۴- ,,	سوم	-/۱۰/-
۲۵- ,,	چہارم	۱/۱۴/-

چوہدری بہاول خان ڈاگرہ صاحب :-

۲۶- اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام		۱/۶/-

بچوں کی خاص کتابیں :-

۲۷- قاعدہ ہماری کتاب		-/۱۰/-
۲۸- ہماری کتاب	اول	-/۱۲/-
۲۹- ,,	دوم	۱/-/-
۳۰- ,,	سوم	۱/۴/-
۳۱- ,,	چہارم	۱/۶/-
۳۲- ,,	پنجم	۱/۶/-

اپنی فرمائشیں حسب ذیل پتہ پر ارسال فرمائیے۔

اسلامک پبلیکیشنز - ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور